رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

قیمت ۸؍

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

تصانیف نیاز فتحپوری

تبصرہ نگار: خبیر — تبصرہ نگار: ایجنی

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عار)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعار)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عار)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عار)

علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری سنہ ۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعرا پر بسوط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۵۶۰ صفحات۔ قیمت عار علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری سنہ ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعرا کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت عہر علاوہ محصول

اگر آپ نے خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ نہیں دیا تو کوئی جواب نہیں دیا جائیگا

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بہ وجہ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۹	فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۴۱ء	شمار ۵

ملاحظات ---------- ۲
میرزا غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی ---------- امتیاز علی عرشی ---------- ۹
وقت کا سب سے بڑا مسئلہ ---------- ۱۷
اقبال شاعر کی حیثیت سے ---------- ۲۳
دھوکا (افسانہ) ---------- شنکر سروپ بھٹناگر ---------- ۲۷
لکھنؤ کی زبان ---------- سید محمد باقر شمس (لکھنوی) ---------- ۳۱
تاریخ اودھ کا ایک ورق ---------- مشیر احمد علوی ---------- ۴۳
باب المراسلۃ والمناظرہ ---------- ۵۰
مکتوبات نیاز ---------- ۵۳
باب الاستفسار ---------- ۵۷
دماغی تفریح ---------- ۵۹
معلومات ---------- ۶۱
منظومات ---------- عدم، قیصر، محب ---------- ۶۳

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۲۹	مئی سنہ ۴۱ء	شمار ۵

ملاحظات

معذرت

پچھلے مہینے ملاحظات کے سلسلہ میں، میں نے "ندویوں کے اخلاق" کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا تھا اور پٹنہ کے ایک اخبار "دورِ جدید" کی ایک عبارت نقل کرتے ہوئے اسے مسعود عالم صاحب ندوی سے منسوب کیا تھا

مینے یہ ایک تراشہ کی بناء پر لکھا تھا جو پٹنہ کے ایک صاحب نے بھیجا تھا اور جسکے ایک گوشہ میں سُرخ روشنائی سے "اڈیٹر: مسعود عالم ندوی" تحریر تھا

اب مجھے معلوم ہوا کہ مسعود عالم صاحب ندوی، اس اخبار کے اڈیٹر نہیں ہیں اور وہ عبارت ان سے منسوب نہیں کیجا سکتی میں سمجھتا ہوں کہ مسعود عالم صاحب ندوی کو اس نسبت سے تکلیف ہوئی ہوگی کیونکہ وہ تحریر ہی ایسی تھی جس کی نسبت سے ہر انسان کو ننگ و عار آنا چاہیئے اور اس لئے میں معذرت خواہ ہوں

اس اشاعت کے مقالات

اس مہینے میں سب سے پہلا مقالہ "تقسیم دولت" سے متعلق ہے جس کے حل کرنے کے لئے اس وقت ساری دنیا بیتاب ہے۔ وہ لوگ جو ملوکیت یا آمریت کے طرفدار ہیں انھیں تو خیر اس کا دشمن ہی ہونا چاہیئے، لیکن جمہوری حکومتیں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتیں۔ اس کا اگر یہ سبب نہیں ہے کہ جن حکومتوں کو جمہوریت سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل خود سرمایہ داری کی بنیاد پر قایم ہیں، تو پھر ان کا فرض ہے کہ وہ اس تحریک ہی میں اصلاح کرکے اُسے جمہوریت بنائیں، اگر اُن کی جمہوریت اُس سطح تک نہیں پہونچ سکتی

سرمایہ و عمل کی جنگ کو اتنا زمانہ ہوچکا ہے کہ اب زیادہ عرصہ تک نتیجہ کا انتظار نہیں کیا جا سکتا اور اگر ارباب سیاست و دولت

نے کوئی درمیانی راہ صلح و آشتی کی جلد پیدا نہ کی، تو پھر یہ سیلاب قابو سے باہر ہو جائے گا اور سیلاب کا پہلا کام تخریب ہی ہے ؟

دوسرا مقالہ "اقبال کی شاعری" سے متعلق ہے جس کا کچھ حصہ لکھنؤ کے لاسلکی اسٹیشن سے نشر ہوا تھا۔ اقبال کی شاعری فنی حیثیت سے یقیناً بہت بلند چیز ہے لیکن پیغام کے لحاظ سے وہ بہت محدود ہے۔ اگر اقبال، اسلام و اسلامیات سے بلند ہو کر بجائے "مردِ مومن کے" "انسانِ محض" کو پیش کرتا تو اُسکی حیثیت ایک کائناتی شاعر کی سی ہو جاتی۔ لیکن شاید اقبال کا ماحول اس کا متحمل نہ تھا!

"لکھنؤ کی زبان" پر مولوی سید محمد باقر شمس لکھنوی کا مقالہ اس مہینے ختم ہو گیا۔ انھوں نے لکھنؤی زبان کی حمایت و طرفداری میں اتنے اقتباسات و حوالہ جات پیش کئے ہیں کہ ان کی مخالفت ممکن نہیں، تاہم اگر کوئی صاحب اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنا چاہیں تو نگار کے صفحات حاضر ہیں

تاریخ اودھ کے سلسلہ میں اس مہینے "مُنّا جان" کی ولادت کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ واقعہ تاریخ اودھ کا سخت اختلافی مسئلہ ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تاریخ اودھ پر ماہرانہ نظر رکھنے والے اس پر اظہارِ خیال فرمائیں۔ جناب تصدق حسین صاحب لکھنوی کو میں خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں

مولوی محمود علی خانصاحب بھوپالی کے "جدید رسم خط" پر اسوقت تک بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے، حالانکہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور محمودی رسم خط اپنے اندر بہت سی ایسی خصوصیات رکھتا ہے جو اس وقت تک کے ایجاد کئے ہوئے کسی رسم خط میں نہیں پائی جاتیں آیندہ مہینے ایک اور رسم خط پیش کیا جائے گا، جو دہلی کے کسی صاحب نے ایجاد کیا ہے

"دماغی تفریح" کا سلسلہ زیادہ تر طالب علموں کے لئے ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ ہم آپ کبھی بچہ بننے کی کوشش ہی نہ کریں

گہے طفلے شود مستانہ می رقص !

اب کیا ہوگا ؟

جس کا اندیشہ تھا وہ آخر پورا ہو کر رہا، یعنی یوگوسلیویا ختم ہو گیا اور یونان بھی دم توڑ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان خدا کی قہاریت و جباریت کا مظہر بن جاتا ہے تو "قدوسیت" کو اس کے سامنے سپر ڈالنا ہی پڑتی ہے

بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یوگوسلیویا اور یونان نے حماقت کی کہ خواہ مخواہ پہاڑ سے سر ٹکرا کر اپنے آپ کو ہلاک کیا، لیکن ہلاکت ہی کی بعض داستانوں کے اندر زندگی کے سبق پوشیدہ ہوتے ہیں معرضِ ہلاکت میں آنے والے ہمارے تجربات ہوا کرتے ہیں نہ کہ اُصول۔ اس لئے یونان و یوگوسلیویا کی شکست کوئی اُصولی نتیجہ نہیں بلکہ تجرباتی نتیجہ ہے اور تجربات میں قربانیاں کرنا ہی پڑتی ہیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان دونوں ملکوں نے صرف برطانیہ یا امریکہ کی مدد کے بھروسہ پر مقابلہ کیا تھا، کیونکہ وہ خود سمجھتے تھے کہ بہ حالات موجودہ جبکہ برطانیہ خود اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہے کوئی معقول مدد نہیں دے سکتا تھا، اس لئے ان کی جنگ صرف اُصول کی حمایت میں تھی اور یہ ضروری نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ وہی ہو جو ہونا چاہئے یا وہ کبھی نہ ہو جو نہ ہونا چاہئے

اب لڑائی کا رُخ کیا ہوگا۔ اس کی بابت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اب یہ بادل مغرب کی طرف سے مشرق کی طرف بڑھتے نظر آ رہے ہیں

جن لوگوں نے بحرِ روم کے نقشہ کا غور سے مطالعہ کیا ہے، اُن سے یہ امر پوشیدہ نہ ہوگا کہ اگر مغرب میں جبرالٹر اور مشرق

میں نہر سویز، انگریزوں کے ہاتھ سے نکل جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ برطانوی حکومت کی کمر کاٹ دی گئی اور اس کا دھڑ دو ایسے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا جن کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے ہٹلر کی انتہائی تمنا یہی ہو سکتی ہے کہ وہ مشرق کی طرف نہر سویز پر قابض ہو جائے اور مغرب کی جانب جبرالٹر پر، تاکہ بحر روم پر برطانیہ کا اقتدار بالکل ختم ہو جائے۔ لیکن یہ اسوقت تک ممکن نہیں، جب تک افریقہ کے تمام ساحلی مقامات اور خصوصیت کے ساتھ مصر و اسکندریہ پر اس کا قبضہ نہ ہو جائے اور اسپین بھی اس کا شریک نہ ہو۔ اس لئے ممکن ہے کہ اب لڑائی کا رُخ کچھ ایسا ہی ہو اور یہ رُخ یقیناً فیصلہ کُن ہوگا کیونکہ اس کے بعد ترکی اور روس کی پالیسی بھی متعین ہو جائے گی، جاپان کے ارادے بھی واضح ہو جائیں گے اور امریکہ کو بھی کھلم کھلا میدان میں آجانا پڑے گا

چنانچہ روس کے متعلق ابھی سے یہ خبریں آنے لگی ہیں کہ وہ ایران کے صوبۂ آذربیجان کو لینا چاہتا ہے اور خلیج فارس میں بھی کچھ مطالبات پیش کرنے والا ہے۔ جاپان کے فوجی اجتماعات سے بھی برما سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور اس لئے یا اگر کسی وقت ایشیا کو بھی گھیر لے تو تعجب نہیں

یوگوسلیویا اور یونان کی فتح کے بعد جرمنی کا دیرینہ خواب برلن سے بغداد تک یقیناً دائرۂ تعبیر کے اندر آجائے گا اور ہٹلر انتہائی کوشش کرے گا کہ وہ موصل و عراق کے پٹرول پر قبضہ کرکے جلد سے جلد اس تعبیر کو پورا ہوتے ہوئے دیکھے!

جنگ کے شعلے اور ہندوستان

اب سے ڈیڑھ سال پہلے جب لڑائی پولینڈ میں شروع ہوئی تو ہندوستان کیا خود یورپ میں بھی زیادہ عرصہ تک اس کے جاری رہنے کا یقین لوگوں کو نہ تھا اور عام طور پر یہ خیال قایم کیا گیا تھا کہ پچھلی لڑائی کی طرح یہ بھی مغربی یورپ تک محدود رہے گی اور وہیں ختم ہو جائے گی، لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا اور جنگ کے زمانی و مکانی دونوں حیثیت سے وسعت اختیار کر لی

جب فرانس کو شکست ہوئی اور اٹلی بھی لڑائی میں شریک ہو گیا تو جنگ کی نوعیت بھی بدلی اور ابتداء میں اٹلی کو جو کامیابیاں افریقہ میں ہوئیں، اُن سے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر نہر سویز و عدن پر اس کا قبضہ ہو گیا تو ہندوستان پر بھی وہ ضرور حملہ کرے گا۔ لیکن اٹلی کی کامیابیاں بہت عارضی ثابت ہوئیں اور اپنی بحر روم کی ناکامیوں کا انتقام لینے کے لئے اس نے یونان پر حملہ کر دیا جس کا نتیجہ اس کے موافق نہ نکلا

اسی دوران میں محوری طاقتوں نے جاپان کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا اور اس واقعہ نے مشرق اور ہندوستان کے لئے پھر خطرہ پیدا کر دیا۔ کیونکہ جاپان کا محوری طاقتوں کے ساتھ شامل ہو جانا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ اگر اس نے مشرق میں جنگ شروع کی تو یہ جنگ برطانیہ کے خلاف ہوگی اور اس صورت میں ہندوستان کا محفوظ رہنا محال ہے۔ اس نے اس معاہدہ کے بعد ہی انڈوچائنا میں اپنے اثرات قایم کرنا شروع کئے، چین کے بعض شمالی جزائر میں بھی فوجی اجتماع ہونے لگا اور ایسٹ انڈیز پر دباؤ ڈالکر فراہمی پٹرول کا انتظام بھی اس نے کر لیا اور یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جاپان آہستہ آہستہ ہندوستان کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کی نیت اچھی نہیں ہے

مشرق میں جاپان یہ چالیں چل ہی رہا تھا کہ لڑائی نے ایک اور رُخ بدلا یعنی وسطی یورپ میں بھی لڑائی کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ یقیناً ہٹلر بلقان میں لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ ضرور چاہتا تھا کہ اس کے اثرات تمام وسطی یورپ پر

قایم ہوجائیں، چنانچہ ہنگری، رومانیا اور بلغاریا میں وہ کامیاب بھی ہوگیا، لیکن یوگوسلیویا نے آخر وقت میں انکار کردیا اور اس طرح ہٹلر کو اپنی فوجیں یونان اور یوگوسلیویا کی طرف بڑھانی پڑیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے افریقہ میں بھی اقدام شروع کیا اور بعض اہم ساحلی مقامات انگریزوں سے واپس لے لئے

ان تمام باتوں سے ہٹلر کا مدعا یہ ہے کہ وسطی یوروپ سے برطانیہ کو بالکل نکال باہر کرے اور نہر سویز چھین لے۔ وہ جانتا ہے کہ نہر سویز برطانوی حکومت کی شہ رگ ہے اور اگر یہ کٹ گئی تو پھر ایشیائی مقبوضات سے اُس کے تعلقات بالکل منقطع ہوجائیں گے اور اس صورت میں ہندوستان پر حملہ ہونا بالکل یقینی ہے خواہ جاپان کی طرف سے ہو یا مشرق ادنیٰ کو عبور کرکے ایران و بلوچستان کی طرف سے

اسی کے ساتھ جو خبریں جبرالٹر کے متعلق آرہی ہیں وہ بھی کم تشویشناک نہیں۔ برطانیہ کا وہاں کی قلعہ بندیوں کو اور مضبوط کرنا، شمال کی طرف خشکی کے حصہ میں گہری خندقیں کھودنا اور روزانہ لڑائی کے سامان کا وہاں پہونچتے رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ برطانیہ اُس طرف سے بھی مطمئن نہیں ہے اور جنرل فرانکو نے جو بیان حال میں شایع کیا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اسپین کو یقین ہوگیا کہ برطانیہ کی مخالفت کرکے وہ فایدہ اُٹھا سکتا ہے تو شاید وہ بھی ہٹلر کا شریک ہوجائے

فرانس کی وشی حکومت نے ابھی تک ہٹلر کے مطالبات کو تسلیم نہیں کیا، لیکن وہاں کی حکومت خود متزلزل حالت میں ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہاں پھر لیوال کا اقتدار قایم ہوجائے اور ہٹلر کے ہاتھ مضبوط ہوجائیں

ہٹلر نے انگلستان کے ساحلی مقامات پر بھی بمباری جاری رکھی ہے اور اٹلانٹک میں بھی اس کی آبدوز کشتیاں برطانوی جہازوں کو نقصان پہونچا رہی ہیں، یعنی اگر ہٹلر اپنی صرف ایک محاذ والی اسکیم میں کامیاب نہیں ہوسکا تو اس نے برطانیہ کے لئے بھی کئی محاذ پیدا کردئے ہیں۔ یہ بھی ہندوستان کے لئے سخت خطرہ کی بات ہے کیونکہ اس صورت میں برطانیہ اپنی ساری قوت ہندوستان کی حفاظت پر صرف نہ کرسکے گا

یوگوسلیویا اور یونان کے بعد ہٹلر غالباً شام پر دباؤ ڈالے گا اور وشی حکومت اس دباؤ کے ماننے پر مجبور ہوگی۔ شام سے فلسطین کی سرحد بالکل ملی ہوئی ہے اور یہاں سے نہر سویز بالکل قریب واقع ہے۔ اس لئے یونان میں ہٹلر کی کامیابی نہر سویز کے لئے نہایت سخت خطرہ ہے اور نہر سویز کا ہر خطرہ ہندوستان کا خطرہ ہے۔ عراق و فلسطین میں برطانوی فوجوں کا اجتماع ہو رہا ہے اور اگر ہٹلر نے ادھر بڑھنے کا قصد کیا تو اس میں شک نہیں کہ یہ جنگ بڑے معرکہ کی ہوگی

یونان سے فلسطین آنے کے دو راستے ہیں، ایک ترکی کی طرف سے دوسرا سمندر کی طرف سے۔ اگر ترکی نے جرمن فوجوں کو ملک سے گزرنے کی اجازت نہ دی تو عراق سے پہلے یہیں بڑا معرکہ ہوگا جس میں عراق کی برطانوی فوجیں بھی ترکی کی پوری مدد کریں گی اور بصورت ناکامی ہٹلر کو مجبوراً سمندر کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور یہ پہلو برطانیہ کی موافقت میں ہے، کیونکہ خشکی کی لڑائی میں جرمنی خواہ کتنا ہی قوی ثابت ہو، لیکن پانی میں یقیناً وہ برطانیہ کا حریف نہیں ہوسکتا۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ جرمنی، ترکی کی طرف سے عراق کی طرف بڑھنے کی پوری کوشش کرے گا

جاپان کے مشرقی اقدام کے لئے اسوقت تک سب سے بڑی روک روس تھا کیونکہ جاپان و روس کے درمیان دیرینہ دشمنی چلی آرہی ہے اور جاپان کو اندیشہ تھا کہ اگر اس نے بحر ہند یا بحر پاسفک میں لڑائی چھیڑ دی تو ممکن ہے روس، سائبریا کی طرف سے منچوکو پر

کردے۔ لیکن روس اور جاپان کے درمیان جو پانچ سال کا عہدنامۂ صلح وغیر جانبداری حال ہی میں ہوا ہے، اس نے جاپان کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا ہے اور زیادہ اطمینان کے ساتھ ہندوستان کی طرف بڑھنے کی صورتیں اس کے لئے پیدا ہو گئی ہیں

الغرض نہر سویز اور جاپان دونوں طرف سے لڑائی کی آگ آہستہ آہستہ ہندوستان کی طرف بڑھتی آرہی ہے اور ہمکو ہر وقت اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار رہنا چاہئے

ترکی کی گزشتہ و موجودہ پالیسی

چونکہ یونان کی فتح کے بعد ترکی کے مسئلہ نے بہت اہمیت اختیار کرلی ہے اور عجب نہیں کہ درۂ دانیال وغیرہ کے متعلق جرمنی کے مطالبات اس سے شروع ہو جائیں اس لئے نامناسب: ہوگا اگر آپ ترکی کی موجودہ سیاست کو سمجھ لیں

گزشتہ جنگ میں ترکی جرمنی کا حلیف تھا، اس لڑائی میں ابھی تک اس کی حیثیت بالکل غیر جانبدار ہے، لیکن وہ یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ برطانیہ کے ساتھ اپنے معاہدات کا احترام ضرور کرے گا۔ یہ غور طلب بات ہے کہ ترکی نے پچھلی لڑائی کے واقعات کو کیوں فراموش کر دیا اور اپنے سابق حریف (برطانیہ) کی طرف اب کیوں مایل نظر آتا ہے، برطانیہ، جس کی دوستی کی طرف ترکی کا رجحان بتایا جاتا ہے، وہی برطانیہ ہے جس کے ایک وزیر اعظم نے کہا تھا کہ "اب ترکی کو یوروپ سے نکل جانا چاہئے" اور دوسرے وزیر اعظم نے فرانس اور روس کے ساتھ عثمانی حکومت کے حصے بخرے کرنے کا خفیہ معاہدہ کیا تھا، پھر ترکی ان باتوں کو کیوں بھول گیا اس کے سمجھنے کے لئے ہم کو پچھلے واقعات پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے

۱۴ء کی لڑائی میں ترکی و جرمنی کے اتحاد کی ذمہ داری بڑی حد تک اطالیہ کے سر تھی۔ جزیرۂ ڈوڈاکنیز میں اطالویوں کی موجودگی ایک طرف ایشیائے کوچک کے لئے اور دوسری طرف اُن بحری راستوں کے لئے جو درۂ دانیال، استنبول، رومانیہ اور روس کو جاتے ہیں ہمیشہ مصیبت کا سبب رہی۔ ۱۹۰۹ء میں روس اور اطالیہ کے مابین ایک معاہدہ ہوا جو معاہدۂ راکونی جی (Racconigi) کے نام سے مشہور ہے، اس معاہدہ میں اطالیہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ درۂ دانیال اور آبنائے باسفورس میں روسی مفاد کا احترام کرے گا۔ اصل قصہ یہ تھا کہ سابق معاہدہ کی رو سے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال صرف ترکی جنگی بیڑے کی آمد و رفت کے لئے مخصوص تھا اور اس راہ سے روس کا یا کسی اور سلطنت کا جنگی بیڑہ آجا نہیں سکتا تھا، لیکن زار کی دیرینہ تمنا تھی کہ باسفورس اور درۂ دانیال اس کے جنگی بیڑے کے لئے بھی کھول دیا جائے

۱۱ء میں اطالیہ نے اسی معاہدۂ راکونی جی کی بنا پر ترکی کو جنگ کا الٹیمیٹم دیدیا اور ۱۲ء میں درۂ دانیال پر اطالویوں کا قبضہ ہو گیا۔ ..... اسی سال بلغاریہ، سرویہ، مانٹی نیگرو اور یونان نے ملکر ترکی کے خلاف ایک محاذ قایم کیا اور اس متحدہ محاذ کا نام "بلقان لیگ" رکھا، جو زار روس کے اشارہ پر وجود میں آئی تھی

اکتوبر ۱۲ء میں معاہدۂ لوزان کے ساتھ اطالیہ اور ترکی کی لڑائی ختم ہوئی اور یہ طے پایا کہ ترکی سپاہی جونہی لیبیا خالی کرینگے ویسے ہی اطالوی سپاہی ڈوڈاکنیز کے جزیرے کو خالی کر دیں گے، لیکن ابھی اس معاہدہ کی روشنائی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ یونان و ترکی کی لڑائی چھڑ گئی۔ اس موقعہ پر یونانیوں نے اطالیہ کو مجبور کیا کہ وہ ڈوڈاکنیز کے جزیرے کو خالی نہ کریں۔ اطالیہ پہلے بھی شاید اس کے لئے طیار نہ تھا اب اُسے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانا ہو گیا

ترکی نے مجبوراً اس محاذ کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ کی طرف نگاہ کی، لیکن برطانیہ نے اپنی معذوری کا اظہار کیا،

کیونکہ اُس وقت زار کی حکومت کے خلاف وہ کوئی قدم اُٹھانا نہیں چاہتا تھا، اس لئے ترکی کے سامنے صرف ایک راہ رہ گئی، اور وہ یہ کہ ترکی جرمنی کی حمایت حاصل کرے

اسی دوران میں جب اطالیہ نے ڈوڈاکنیز کا جزیرہ ترکوں کے حوالہ کرنے سے انکار کیا تو برطانیہ اور فرانس کو تشویش پیدا ہوئی کیونکہ اس طرح اطالیہ کو بحیرہ روم میں مرکزی حیثیت حاصل ہوئی جاتی تھی۔ اس موقعہ پر برطانیہ اور فرانس نے ترکی اور یونان دونوں کو صلح کرنے پر مجبور کیا اور یہ طے پایا کہ لندن میں ایک کانفرنس ہو اور وہ کانفرنس جو کچھ طے کردے دونوں حکومتیں اُس کو مان لیں۔ کانفرنس ہوئی لیکن اُس کی پالیسی سے ترکی متفق نہ ہوسکا اور اُس نے احتجاج شروع کیا۔ جرمنی ایسے موقعہ کی تاک ہی میں بیٹھا تھا، اُس نے ترکی کی حمایت کی اور اس طرح سنہ ۱۴ء کی لڑائی میں ترکی، جرمنی کا حلیف بن گیا

لیکن اس لڑائی میں ترکی کیوں برطانیہ کی طرف مایل ہے، اس کے کئی سبب ہیں۔ سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ ترکی میں جمہوریت کی روح بہت قوی ہوگئی ہے اور قدرتاً اسے انھیں حکومتوں کے ساتھ دلچسپی ہونا چاہئے جو اپنے آپ کو جمہوریت پسند کہتی ہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ جس وقت مصطفےٰ کمال نے نئی ترکی کی بنیاد ڈالی تھی تو یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ترکی خالص قومی حکومت ہوگی اور یوروپ کی طرف بڑھنے کا خیال وہ ترک کردیگا، لیکن درۂ دانیال کا مسئلہ سخت نزاعی مسئلہ تھا، اس لئے مغربی حکومتوں نے آبنائے باسفورس سے لیکر درۂ دانیال تک کا حصہ بدستور ترکی کے پاس رہنے دیا اور اسی کے ساتھ یوروپ کا اتنا ٹکڑا بھی جو درۂ دانیال کی حفاظت کے لئے ترکی کے پاس رہنا ضروری تھا

چونکہ درۂ دانیال خود ترکی کے حفظ وبقا کے لئے بھی ضروری ہے، اس لئے قدرتاً اسے برطانیہ ہی کی طرف مایل ہونا چاہئے کیونکہ درۂ دانیال کی حفاظت کے لئے بحری امداد کی ضرورت ہے اور یہ زیادہ تر برطانیہ ہی سے ملسکتی ہے

تیسرا سبب یہ ہے کہ تجارتی حیثیت سے بھی ترکی کا فایدہ برطانیہ کا ساتھ دینے میں ہے، چنانچہ یہاں کی پیداوار کا اکثر حصہ برطانیہ ہی میں جاتا ہے اور اس کی مجموعی قیمت سوا کروڑ پونڈ سالانہ سے کم نہیں

ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ ترکی کے جغرافیائی تعلقات جزائر نمائے عرب اور عراق سے بہت زیادہ ہیں اور یہاں برطانوی فوجوں کا اتنا زبردست اجتماع رہتا ہے کہ ترکی کو قدرتاً دبنا ہی چاہئے۔ الغرض یہ ہیں وہ اسباب جن کی بناء پر ترکی کو برطانیہ کے ساتھ ہمدردی ہونا چاہئے، لیکن میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ یہ ہمدردی ترکوں کو لڑائی کی حد تک کھینچ لائے گی

اگر ترکی، جرمنی کے خلاف لڑائی پر آمادہ ہوسکتا، تو یہ فرض اسی لڑائی کے دوران میں کئی بار اس پر عاید ہوچکا ہے اور وہ کبھی کا شریک جنگ ہوچکا ہوتا

جب جرمن فوجوں نے بلغاریا کی سرحد پر اجتماع کیا تو ترکی نے کہدیا کہ وہ بلغاریا کے اندر سے جرمن افواج کا عبور گوارا نہ کرے گا، لیکن وہاں جرمن فوجیں پہونچ بھی گئیں اور ترکی خاموش رہا، اس کے بعد ترکی نے اعلان کیا کہ اگر یونان پر جرمنی نے حملہ کیا تو وہ ضرور اس کی مدد کرے گا، لیکن آج جرمن جھنڈا یونان کے پایۂ تخت پر لہرا رہا ہے اور ترکی بدستور خاموش ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر چند ترکی، برطانیہ کا ساتھ دینا چاہتا ہے لیکن لڑائی کی آگ میں کودنے کو طیار نہیں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگا یا نہیں ۔ اسوقت صورت حال یہ ہے کہ جرمنی، بلقان کی تمام ریاستوں پر تو قابض ہوچکا ہے لیکن برطانیہ کی سلطنت کا کوئی حصہ اس کے قبضہ میں نہیں آیا

انگلستان پر ہٹلر کے ہوائی حملے اس وقت تک بالکل ناکام ثابت ہوئے ہیں اس لئے وہ اپنی زد کا رُخ ضرور بدلے گا اور چونکہ یونان اور بحر ایجین کے بعض جزایر لینے کے بعد نہر سویز اور عراق و فلسطین سے وہ قریب تر ہوگیا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ آگے نہ بڑھے اور بلقان کی لڑائی یونان ہی تک پہونچکر ختم ہو جائے

اس صورت میں یقیناً وہ ترکی سے کہے گا کہ اپنی حدود سے جرمن فوجوں کو گزرنے کی اجازت دے، چنانچہ ترکی کے بعض ذمہ دار لوگوں کی نقل و حرکت سے پتہ چلتا ہے کہ شاید اس قسم کی گفتگو شروع بھی ہوگئی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ترکی اس کی اجازت دیدے گا؟

اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اگر ترکی نے اجازت نہ دی تو جرمنی اس پر بھی حملہ کردیگا یہ صحیح ہے کہ اس صورت میں برطانوی فوجیں جو عراق و موصل میں موجود ہیں، ترکی کی پوری مدد کریں گی اور ہو سکتا ہے کہ جرمنی کو اس طرح کچھ عرصہ تک اُلجھایا جا سکے، لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ نازی سیلاب کو بالکل اس طرح روک دیا جائے گا۔ کیونکہ روس کی طرف سے بھی ترکی کو پورا اطمینان نہیں ہے اور اگر یہ خبر صحیح ہے کہ اس نے ایران سے صوبہ آذربیجان کا مطالبہ کیا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کی پالیسی یقیناً برطانیہ کے خلاف ہوتی جاتی ہے

جاپان کے ساتھ روس کا معاہدہ یقیناً کسی خاص اندرونی سمجھوتے کی بنا پر ہوا ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ یہ سمجھوتا یہی ہو کہ روس، ایشیا میں اپنے اثرات وسیع کرے گا اور جاپان برما اور ہندوستان کی طرف بڑھے گا

اسی کے ساتھ آپ اس خبر کو بھی شامل کیجئے کہ پرتگال اور اسپین میں نازی اثرات بڑھ رہے ہیں تو آیندہ نقشۂ جنگ کی صورت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ غالباً جبرالٹر اور سواحل افریقہ سے لیکر نہر سویز، بحر ایجین، درۂ دانیال ترکی، عراق بلکہ ایران و ہندوستان تک ہر جگہ یہ آگ ایک ساتھ بھڑک اُٹھے گی، لیکن ان خطرناک حالات میں ہمیں مایوس نہ ہو جانا چاہئے کیونکہ امریکہ بھی جلد اس لڑائی میں برطانیہ کے ساتھ شریک ہونے والا ہے جس سے برطانیہ کی تاب مقاومت یقیناً بہت بڑھ جائے گی اور یہی وہ چیز ہے جس پر ہمیشہ لڑائیوں کی کامیابی کا انحصار رہا ہے اور اب بھی برطانوی حکومت کو اس پر پورا یقین ہے

مسٹر چرچل کی تازہ ترین تقریر

بلقان کی لڑائی کے بعد مسٹر چرچل وزیر اعظم انگلستان نے سب سے پہلی تقریر ۲۸ اپریل کو کی اور جیسا کہ مسٹر چرچل کا قاعدہ ہے، انھوں نے پوری صفائی کے ساتھ اپنی مایوسیوں کا بھی ذکر کیا اور اُن غلطیوں کا بھی جو اس جنگ کا باعث ہوئیں، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا کہ اگر امریکہ نے برطانیہ کا ساتھ دیا جس کا پورا یقین ہے تو پھر ان کے ذرایع جنگ و دفاع اتنے وسیع ہو جائیں گے کہ جرمنی کو آخر میں تھکا کر آسانی سے گرایا جا سکے گا — مسٹر چرچل نے جنگ کے مستقبل کی طرف سے بھی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے، کہا ہے کہ بحر روم اور مصر تو خطرہ میں تھا ہی لیکن اب مراکش و اسپین، بلکہ روس و ترکی تک اس آگ کے پھیل جانے کا اندیشہ ہے، اور ہو سکتا ہے کہ اوکرین کے ذخایر غلہ اور قاف کے پٹرول جرمنی کے ہاتھ آجائیں اور بحر کاسپین میں بھی اس کا اقتدار قایم ہو جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ انھیں اس کا بھی یقین ہے کہ جب تک اٹلانٹک کا راستہ بند نہیں ہوا اور جب تک انگلستان کا جزیرہ دنیا میں موجود ہے، نازی حکومت کی یہ کامیابیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں اور آخر میں برطانیہ و امریکہ کی ۲۰۰ ملین آبادی، جرمن قوم کی ۷۰ ملین آبادی پر ضرور غلبہ پائے گی۔

میرزا غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی

میرزا غالب مرحوم نے کلیاتِ فارسی کی ترتیب و طباعت کے بعد جس قدر فارسی اشعار لکھے تھے اُنھیں "سبدِ چین" کے نام سے اپنی زندگی ہی میں شایع کر دیا تھا۔ لیکن یہ تتمہ اُن کے تمام تازہ شعروں پر حاوی نہ تھا۔ وہ قصیدے، قطعے، اور رباعیاں جنکی نقول اُن کے پاس محفوظ نہ تھیں، یا بروقتِ اشاعت کہیں سے دستیاب نہ ہو سکی تھیں، اس مجموعہ میں نہ آ سکیں۔ چنانچہ ایسی متعدد فارسی رباعیاں "مکاتیبِ غالب"[1] میں چھپ چکی ہیں، جو "سبدِ چین" کے پہلے ایڈیشن میں نہیں ملتیں۔

میرے کرم فرما جناب مالک رام صاحب نے "مکاتیبِ غالب" کی اشاعت کے بعد "سبدِ چین" کا دوسرا اڈیشن شایع کیا، تو اُس میں "مکاتیبِ غالب" کے حوالہ کے ساتھ وہ فارسی اشعار بھی درج کر دئے۔ لیکن اب بھی میرزا صاحب کے فارسی کلام کا کچھ حصہ باقی ہے، جو ابھی تک شرمندۂ طباعت نہ ہو سکا اور یا اُس کی شہرت نہ ہونے پائی۔ موخرالذکر صنف میں اُن کی ایک فارسی مثنوی کا شمار ہو سکتا ہے، جو اُنھوں نے اپنے حقیقی بھانجے، میرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کی فرمایش پر لکھی تھی۔ یہ مثنوی "دعاء الصباح" کا ترجمہ ہے، جو امیر المومنین حضرت علی بن ابیطالب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

نسخہ کی کیفیت اس مثنوی کا قلمی نسخہ کتاب خانۂ رامپور کے ایک مجموعہ میں نیازمند کو دستیاب ہوا، جو ۱/۲ ، × ۳/۴ ۴ سائز کے ۲۲ صفحات پر ۱۲۸۴ھ میں امروہہ کے ایک بزرگ محمد علی بن سید برخوردار علی نامی نے نقل کیا تھا۔

اس قلمی نسخہ میں اولاً اصلِ دعا کا عربی متن سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اُس کے نیچے منثور فارسی ترجمہ شنگرفی روشنائی سے اور ترجمۂ نثر کے نیچے منظوم ترجمہ، متنِ عربی کی ہمرنگ سیاہ روشنائی سے تحریر ہے۔ عبارت کے چاروں طرف قرمزی دُہری جدول ہے اور متنِ عربی، ترجمۂ نثر، اور ترجمۂ نظم کو باہم جدا کرنے کے لئے بھی قرمزی لکیریں کھینچی گئی ہیں۔ یہ کتاب مجموعہ کے ورق ۵۶ ب سے شروع ہو کر ۶۷ ب پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن کاتبِ مجموعہ نے ہر رسالہ کے اوراق پر جداگانہ ہندسے ڈالے ہیں۔ کاغذ باریک یورپی ہے۔ کہیں کہیں پیوندکاری اور اکثر جگہ کرم خوردگی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

مثنوی کا آغاز مفاتیح النجات، مصنفۂ محمد باقر بن محمد مومن خراسانی السبزواری، کے ایک اقتباس سے ہوتا ہے جس میں اس دعا کی فضیلت اور اس کے نام کا ذکر ہے اور کسی بزرگ کی زبانی یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں نے امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلم کا

---

[1] مکاتیبِ غالب، میرزا صاحب کے اُن ۱۱۵ غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے، جو نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں اور اُن کے درباریوں کو مختلف اوقات میں میرزا صاحب نے لکھے تھے۔ یہ مجموعہ ایک مفصل دیباچہ اور تشریحی حاشیوں کے ساتھ نہایت عمدہ ٹائپ میں شایع کر دیا گیا ہے، اور چار روپیہ قیمت میں کتاب خانۂ ریاست رام پور سے مل سکتا ہے۔

ایک سفینہ دیکھا، جس کی تاریخ کتابت ۱۲۵۰ھ تھی۔ اُس میں درج تھا کہ یہ دعا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہے تمہید کا عنوان "اسنادِ دعاءِ صباح" ہے، جو شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک دعا لکھی ہے، جو دعاء الصباح سے پہلے پڑھی جانا چاہیئے۔ اس کا عنوان ہے "هٰذَا الْاِعْتِصَامُ يُقْرَأُ سَبْعَ مَرَّاتٍ"۔ اور یہ بھی شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد دوسرے ورق کے دوسرے صفحہ سے "دعاءِ صباح" شروع ہوتی ہے۔ اس کے آغاز میں دعاء الصباح شنگرفی روشنائی سے ایک دُہرے خط کے نیم شنگرفی نیم دائرہ کے اندر لکھا گیا ہے۔ اس صفحہ پر جدولوں کے بالائی گوشوں میں دو شنگرفی چھوٹے چھوٹے دائرے بھی بنائے گئے ہیں۔

دعاء الصباح ورق ۱۱ ب پر ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد ۱۲، الف و ب پر امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول دُعا، ایک اُردو عنوان کے نیچے ترجمۂ نثر و نظم کے ساتھ درج ہے۔ اس کے خاتمہ پر کاتب نے لکھا ہے:

"دعای ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام معہ ترجمۂ نثر و نیز ترجمۂ منظوم مرزا اسد اللہ خاں غالب موسوم بہ دعای صباح حسب الایمای مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ، بمطبع منشی نول کشور رونق طبع یافتہ۔ بود بست و سوم شہر رجب سنہ یکہزار و دو صد و ہشتاد و چہار۔ بندہ حقیر فقیر محمد علی بن سید برخوردار علی امروہوی نقل برداشت"

مندرجۂ بالا عبارت کے جن الفاظ کے ذریعہ ۱۲۸۴ھ ظاہر کیا گیا ہے، یہاں غالباً کاتب نے سالِ طباعت کتاب نقل کیا تھا۔ لیکن بعد ازاں اُس کو مٹا کر سالِ کتابت لکھا ہے۔ بہر حال اس سے اتنا یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمۂ منظوم میرزا عباس بیگ صاحب کی فرمائش پر منشی نول کشور کے مطبع لکھنؤ میں میرزا غالب (متوفی ۱۲۸۵ھ) کی زندگی میں چھپا تھا، اور ان کے انتقال سے ایک سال، تین مہینے، کچھ دن قبل نسخۂ مطبوعہ سے اس کی نقل کی گئی۔

کاتب کے خاتمہ کے ظاہری الفاظ سے، جو دراصل نسخۂ مطبوعہ کا خاتمہ ہے، یہ مترشح ہوتا ہے کہ دونوں ترجمے میرزا غالب کے ہیں، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ صرف ترجمۂ منظوم میرزا صاحب کا ہے، نثر کا ترجمہ کسی عربی داں عالم نے کیا ہوگا، جس پر لفظی اصلاح ممکن ہے میرزا صاحب نے بھی دیدی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرزا صاحب زبانِ عربی کے ایسے ادیب نہ تھے کہ دعاء الصباح کی عبارت کا از خود ترجمہ کر لیتے۔ میرے اس خیال کی تائید خاتمہ کی عبارت کو بغور پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ اگر دونوں ترجمے میرزا صاحب کے ہوتے، تو عبارت یوں ہونی چاہیئے تھی "معہ ترجمۂ نثر و ترجمۂ منظوم از مرزا اسد اللہ خاں غالب"۔ یقیناً خاتمہ نگار نے نیز کا اضافہ کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس عبارت میں صرف موخر الذکر فقرہ غالب سے متعلق ہے۔

مثنوی کا رتبہ بلحاظِ شعریت میرزا صاحب کی یہ مثنوی کوئی بلند پایہ نظم نہیں معلوم ہوتی۔ غالباً اسی باعث سے میرزا صاحب نے اس کا تذکرہ کسی جگہ نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے شاگرد رشید حالی مرحوم بھی یادگار غالب میں اسکا ذکر نہ کر سکے لیکن جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ میرزا صاحب نے اصل دعا کے مطلب اور مفہوم کو شعر فارسی میں پورا پورا ادا کر دینے میں کمال کر دکھایا ہے، حتّٰی کہ بہت سے فقروں کا ترجمہ اُتنے ہی مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے، جتنے مختصر الفاظ اصل عربی کے تھے اور شاید ہی کسی جگہ اصل عربی کا کوئی لفظ میرزا صاحب کے ترجمہ کی گرفت سے بچ نکلا ہو۔ مثلاً دعا کا ایک ٹکڑا ہے:

يَا مَنْ اَرْقَدَنِيْ فِيْ مِهَادِ اَمْنِهٖ وَاَمَانِهٖ
وَاَيْقَظَنِيْ اِلٰى مَا مَنَحَنِيْ بِهٖ مِنْ مِنَنِهٖ وَاِحْسَانِهٖ

اس کا ترجمہ میرزا صاحب کی زبان سے اس طرح ادا ہوتا ہے :

ای کہ در گہوارۂ امن و اماں ، خواب را در چشم من کردی نہاں !
باز چشم من بہ بیداری کشاد سوے احسان و عطائی گو بداد

یا مثلاً دعا کا فقرہ ہے :

وَاجبُرِ اللّٰھُمَّ بِھَیْبَتِکَ مِنْ آمَاقِیْ ذَرَفَاتِ الدُّمُوْعِ
وَاَدِبِ اللّٰھُمَّ نَزَقَ الْخَرَقِ مِنِّیْ بِاَزِمَّۃِ الْقُنُوْعِ

میرزا صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں :

دایم از بیم خودت ، اے کردگار ! اشکہا از گوشۂ چشم ببار
سبکیٔ نادانیم تادیب کن از شکیبائی مرا تہذیب کن

لیکن بعض اُن مقامات پر جہاں اصل عربی الفاظ زیادہ مطالب پر حاوی تھے، میرزا صاحب کو ایک یا دو توضیحی شعروں کا اضافہ بھی کرنا پڑا ہے ۔ مثلاً دعا کا فقرہ ہے :

"یَا مَنْ قَرُبَ مِنْ خَطَرَاتِ الظُّنُوْنِ ، وَبَعُدَ عَنْ مُلَاحَظَۃِ الْعُیُوْنِ"

میرزا صاحب فرماتے ہیں :

ای کہ نزدیکی بخطراتِ ظنون ! دور تر ہستی ز دیدارِ عیون !
یعنی از دیدہ شدن ذاتش بری ست برکرانہ از جہاتِ پیکری ست
گوہرِ او از پس و پیش است بیش کرد ہستی را محاطِ علمِ خویش ،

اسی طرح جہاں میرزا صاحب کو اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار کا مناسب موقع ملا ہے، وہاں بھی متعدد شعر بڑھائے ہیں ۔ مثلاً دعا کا فقرہ ہے :

"وَبَابُکَ مَفْتُوْحٌ لِلطَّلَبِ وَالْوُغُوْلِ"

میرزا صاحب فرماتے ہیں :

باب تو مفتوح باشد جاوداں بر رخِ خواہندہ و ناخواندگاں
طالبان و ہم طفیلی آشکار ، بر درِ بکشادہ ات یابند بار
ہر کہ می خوانیش ، می آید بزود ، وانکہ ناخوانیش نیز آید فرود
ایں درت بر روی کس بربستہ نیست خواندہ و ناخواندہ ، جُود اینجا یکیست
از کمالِ جودِ تو ایں فتحِ باب ، تا ہمہ گردند از تو بہرہ یاب
بخششِ خود را تو زنجیر دراز برکشیدی ، ای خدای بے نیاز
خود نمی بندی درت بر روی کس جز برحمت می نہ بینی سوی کس
لطفِ تو عام ست و ہرگز نیست خاص دور تر رفتہ ازیں در اختصاص

بستہ بنود بر رخِ کس بابِ تو ہر کسی رخشاں بود از تابِ تو
ابرِ تو ریزد بہر دامن گہر ہر کسی را فیضِ تو آید ز در
ممسکی و بخل در تو یافت نیست آنکہ در ہستی بود بی بہرہ کیست؟

اگرچہ ان اشعار اور اسی قسم کے بعض اور شعروں میں نسبتہً زیادہ لطف پیدا ہوگیا ہے، لیکن یہاں بھی شاعر کی فکر اصلِ الفاظ کی قید سے مطلقاً آزاد ہوکر پرواز نہیں کرسکی ہے۔ اس لئے میرزا صاحب کی دوسری فارسی مثنویوں کے حمدیہ یا مناجاتی اشعار جیسی والہانہ کیفیت ان میں نہیں پائی جاتی۔

بہرحال یہ مثنوی اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہمیں ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کے ترجمہ کی کوشش کا علم ہوتا ہے۔ چونکہ مطبع نول کشور سے اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہوسکا، اور نہ کسی کتاب خانہ کی فہرست میں اس کا ذکر نظر سے گزرا، اس لئے میں نے کچھ اُس دلچسپی کی بنا پر جو مجھے میرزا صاحب کی شاعری سے ہے، اور زیادہ تر اپنے دوست مالک رام صاحب کے اصرار پر، جو سبدِ چین اور ذکرِ غالب کے ذریعہ "غالب نوازی" کا ثبوت دے چکے ہیں، اس نظم کو شایع کردینا مناسب خیال کیا۔

اس میں شک نہیں کہ میرزا صاحب کے ترجمہ کی خوبی اُسی وقت اچھی طرح منکشف ہوسکتی تھی، کہ اس کے ساتھ عربی دعا بھی چھاپی جاتی، لیکن عربی ادب کے ساتھ دلچسپی اس قدر کم ہوچلی ہے کہ مجھے خطرہ ہوا، مبادا اربابِ ذوق کی نازک طبیعتوں پر میری یہ جرأت بار گزرے۔ اس لئے سردست صرف ترجمہ کی اشاعت پر اکتفا کی گئی۔ اگر حالات نے مساعدت کی اور کبھی اس مثنوی کی طباعت بشکلِ کتاب ممکن نظر آتی، تو اُسی طرح چھاپی جائے گی، جیسے مطبع نول کشور میں میرزا صاحب کی حیات میں چھپی تھی۔

اصلاحِ متن آخر میں یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ میرزا صاحب کے اس ترجمۂ منظوم کی نقل میں کاتب نے متعدد غلطیاں کی تھیں۔ چونکہ محل و موقع سے ان کے خلاف شہادت بسہولت دستیاب ہوتی تھی، اس لئے میں نے زیرِ نظر متن میں اُن کی تصحیح کرکے حاشیہ میں اصل کا لفظ لکھدیا ہے، تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو آزادانہ رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔

یہاں مثال کے بطور ایک غلطی کا تذکرہ کرتا ہوں۔ قلمی نسخہ میں ایک شعر اس طرح لکھا ہے:

ہر کرا خواہی، تو روزی میدہی بیش از اندازہ مقدارش دہی

ظاہر ہے کہ اگر اس شعر میں دہی کو ردیف قرار دیا جائے، تو قافیہ ندارد ہے۔ اور اگر اسکو قافیہ مانیں، تو چونکہ لفظاً و معناً قافیہ دونوں مصرعوں میں ایک ہے، اس لئے تکرارِ قافیہ لازم آتی ہے جو ایک شعر کے اندر واقع ہونے کی وجہ سے ایطائے جلی کی کھلی ہوئی مثال ہوگی

میرے عقیدہ میں میرزا صاحب سے اس قسم کی غلطی کے سرزد ہونے کا امکان ہی نہیں، اس لئے میں نے اس کو کاتب کی تصحیف پر محمول کیا ہے، اور مصرعۂ ثانی کے الفاظ "مقدارش" کو "مقداری" بنایا ہے، تاکہ دہی ردیف اور تی اور مقداری قافیہ بن جائیں۔ چونکہ خطِ شکست میں "مقداری" کی "تی" کوش پڑھا جاسکتا ہے، جس کا تجربہ ہر ادیب کو ہوگا۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس ادبی جرأت کو اربابِ فن قبول فرمالیں گے اور میرزا صاحب کے مذکورہ شعر کو اس طرح پڑھیں گے:

ہر کرا خواہی تو روزی می دہی بیش از اندازہ مقداری دہی — امتیاز علی عرشی

دُعاءُ الصَّباح

ای خدا ای دادرِی[1] کو برکشاد
از درخشیدن زبانِ با مداد

پارہ ہای تارِ شب را آفرید
پردہ ہای تارِ ظلمت درکشید

کرد صنعِ چرخِ گرداں استوار
در مقادیرِ تزیّن آشکار

ای خداوندی کہ تاب آفتاب
کردیکجا با فروغِ التہاب

چہرۂ مہرِ درخشاں برفروخت
باہمہ تابش در آتش رخت سوخت

ای کہ ذاتش را بذاتش رہبری
گشت از ہمجنسیٔ عالم بری

در جہان ہستیش[2] ہمجنس کیست
ہیچ مخلوقی مدد ہمجنس نیست

برتر از کیفیت آمد گوہرش
کیفیتہا نیستی گیرد برش

ای کہ نزدیکی بخطراتِ ظنون!
دورتر ہستی ز دیدارِ عیون

یعنی از دیدہ شدن ذاتش بری است
برکرانہ از جہاتِ پیکری است

گوہرِ او از پس و پیش است بیش
کرد ہستی را محاطِ علم خویش

ہرچہ در عالم بہ ہستی رو نمود
پیش از ہستی بعلمِ او کشود

ای کہ در گہوارۂ امن و اماں
خواب را در چشمِ من کردی نہاں

باز چشمِ من بہ بیداری کشاد
سوی احسان و عطائی کو بداد

دستِ او بر بست دستِ ہر زیاں
قدرتِ او از بدی دادم اماں

برفرست ای داورِ ہستی! درود
برکسی کو سوی تو راہم نمود،

در شبِ تاریک ترشد رہنما
سوی درگاہِ تو ای گیتی خدا!

از سبب ہای تو، ای ربِّ الامیں!
از شرف گیرندۂ حبل المتین[3]،

آں فروزاں گوہری ویژہ نژاد
آنکہ بر دوشِ بلندی پا نہاد

آنکہ آید در نخستیں روزگار
پای او بر جانِ لغزاں استوار

نیز بر آنش کہ از بس طاہر اند
پاک دین و برگزیدہ ظاہر اند

نیک کرداراں دیزداں برگزین
برگزیدہ گوہرانِ پاک دین

ای خدا! بکشا مصاریعِ الصباح
از برای ما، بمفتاحِ الفلاح

یعنی ای دادارِ گیتی دادگر!
برگشا بر ما تو درہای سحر

از کلیدِ لطف درہا باز کن
بہر! سامانِ رحمت ساز کن

بہترین پیرایۂ رشد و سداد
دربرم پوشاں تو، اے ربّ العباد!

برنشاں در من نیازِ بیع الخشوع
از روانم کن رواں عینِ الخضوع

پیشگاہِ عظمتت، اے بے نیاز!
کن رواں از چشمِ من آبِ نیاز

دایم از بیمِ خودت، اے کردگار!
اشکہا از گوشۂ چشمم ببار

سُبکیِ نادانیم تادیب کن،
از شکیبائی مرا تہذیب کن

گر نباشد از تو آغازِ کرم
ور نہ توفیقِ تو باشد رہبرم

کس نیارد بر دنِ من سوے تو
درگشادہ تر رہی در کوے تو

گر مرا علمِ تو بسپارد بہ آز
برکشد ز نجیرۂ حرصم دراز

کس نیامرزد گناہم، اے خدا!
سرنگوں افتادنِ من در ہوا

نصرتِ تو گر مرا نائد[4] معین
گاہِ جنگِ نفس و شیطانِ لعین

ایں چنیں خذلاں بجانم کشد
در ہمہ رنج و تعب جانم کشد

خود مرا می بینی، اے ہستی خدا!
کامدم سویت بامید و رجا

دست پیوستم باطرافِ الحبال
چوں گنہ افگند دورم از وصال

چوں بدوری در شدم از بارگاہ
زانکہ چیرہ شد بمن دستِ گناہ

زشت مرکوبی کہ نفسِ من برآں
از ہوا و حرص شد دایم رواں

واہ! از تسویلِ نفسِ ذوفنون
کاں بود از آرزدہای دلفزون

آہ! زاں خواہش کزو برخاستہ
آرزو ہا آردش آراستہ

---

[1] اصل: دادر۔ [2] اصل: ہستی اش۔ چونکہ میرزا صاحب نے سرور کے نام کے خط میں تصریح کردی ہے کہ بجز اُس لفظ کے جس کے آخر میں ہ ساکن ماقبل مفتوح ہو، اور تمام الفاظ کے ساتھ ت تے ش لاکر لکھے جاتے ہیں، بنابریں یہاں بھی متن میں ملاکر لکھا گیا ہے۔ [3] اصل: الوطین۔ [4] اصل: نیاید

ہر زماں گامی بہر سویش برد
فرشِ خواہشہا بہر سو گسترد

بر درازیہا کشد طولِ امل
تا بدوری افتد از حسنِ عمل

نیست، نادان نفسِ فرماں ناپذیر!
کو بود پیشِ خداوندش دلیر

جرأت و گستاخی و عصیاں کند
سرکشی از طاعتِ یزداں کند

ای خداوندا! من از دستِ رجا
کوفتم دروازۂ رحمِ ترا

سوی تو بگریختم با اضطرار
از وفورِ خواہشِ نا استوار

در رسنہای تو، ای گیتی خدا!
باز پیوستم سرانگشتِ ولا

درگزار[1] از من تو، ای ربّ الورا!
ہر چہ کردم از گناہ و از خطا

اغرشی کز من بیاید آشکار
درگزار از من تو، ای پروردگار!

عفو کن افتادنِ من در بلا
باز دار از ہر چہ زاید زاں عنا

زینکہ ہستی سرور و معبودِ من
غایتِ ہر خواہش و مقصودِ من

در زمانِ ہر کجا گردیدنم
نیز در ہنگامِ آرامیدنم

خود چہ ساں میرانی، ای پروردگار
بینوائی کامدت با اضطرار

یعنی آں مسکیں کہ آمد دست رد
با ہمہ صد ناشکیبی، سوی تو

از گناہِ خود گریزاں آمدہ
وز خطای خود پشیماں آمدہ

رہ پژوہی را کہ خواہد راہِ تو
قصدِ او باشد ہمہ درگاہِ تو

سوی درگاہِ تو باشد تیز گام
میکنی دورش چرا از راہِ کام؟

تشنۂ را باز میداری چرا؟
آنکہ سوی حوضِ تو شد رہ گرا

آب جویاں آمدہ بر چشمہ سار
تالبِ خود تر کند زاں آبشار

زینہار ایں حوضِ تو پر از زُلال
پُر بود ہنگامِ قحط و خشک سال

باب تو مفتوح باشد جاوداں
بر رخِ خواہندہ و ناخواندگاں

طالبان و ہم طفیلی آشکار
بر درِ بگشادہ ات یا بندبار

ہر کہ میخوانیش می آید بزود
وانکہ ناخوانیش نیز آید فرود

ایں درت بر روی کس بربستہ نیست
خواندہ و ناخواندہ، جود اینجا یکیست

از کمالِ جود تو ایں فتحِ باب
تا ہمہ گردند از تو بہرہ یاب

بخششِ خود را تو زنجیرِ دراز
بر کشیدی، ای خدای بی نیاز

خود نمی بندی درت بر روی کس
جبر بر حکمت می نہ بینی سوی کس

لطفِ تو عام است و ہرگز نیست خاص
دور تر رفتہ ازیں در اختصاص

بستہ نبود بر رخ[2] کس بابِ تو
ہر کسی رخشاں بود از تابِ تو

ابرِ تو ریزد بہر دامن گہر
ہر کسی را فیضِ تو آید ز در

ممسکی و بخل در تو یافت نیست
آنکہ در ہستی بود بی بہرہ کیست

غایتِ مامول و مسئولم توئی
آخرِ مقصود و مامولم توئی،

ایں زمامِ نفسِ خود را، ای خدا!
کردہ ام بر بستۂ بندِ رضا

مرکبِ نفسم کہ از بس سرکش است
ہر زمان سر بر فلک چوں آتش است

با رضایت کردہ ام فرماں پذیر
تا بود در مجلسِ فرماں اسیر

ہر چہ ریزندش، ہمہ گیرد بسر،
سر نتابد از قضا و از قدر

ہر چہ پیش آیدش، گیرندہ شود
ہر چہ بر بندش، پزیرندہ شود

گر ہمہ تلخی بریزندش بکام
در کشد کیسر، چناں کز شہد جام

خواہشِ خود را نمایدبے نشاں
خواہشِ تو پیش گیرد جاوداں

از گناہم بود بس بارِ گراں
رافت و رحمِ تو کردش بی نشاں

بی نشانش کردم از الطافِ تو
ساختم معدومش از اعطافِ تو

دیں ہوائی نفسِ من گمراہ کن
از طریقِ راستی بیراہ کن

سوی لطف و رافت بسپردمش
سوی غفاری و عفوت بردمش

ای خدا! بر من بیارایں بامداد
با فروغِ راستکاری ورشاد

دیں سحر را کن تو، ای پروردگار
از برای دین و دنیا پاسدار

شام گاہم را کن بہرم سپر
از فریبِ دشمنانِ کینہ ور

نیز آں شامم مرا کن پاسدار
از ہوا و زمہلکاتِ روزگار

باشدت، بر ہر چہ می خواہی تواں
ہر کرا خواہی، دہی ملکِ جہاں

ملکِ خود را باز بستانی ہمیں
از کسے کش خواہیش کردان چنیں

ہر کرا خواہی، توعزت میدہی
ہر کرا خواہی، تو ذلت میدہی

نیکی و خوبی ہمہ در دستِ تست
ہر چہ باشد ہستیش، پابستِ تست

بر ہمہ ہستی توانائی تراست
دیگری را ایں توانائی کجاست؟

---

[1] اصل: گذار۔ لیکن یہ میرزا صاحب کے املا کے خلاف تھا۔ اس لئے اصلاح کر دی گئی ہے۔ — [2] اصل: بستہ نبود بر رخ آہ۔

شب درون روز می آری همیں
باز روز آری درون شب چنیں

تو برآری زنده را از مرده تن
می برآری مرده از زنده بدن

خون ز جسم و جسم را از آب و خون
از توان خود همی آری برون

بیضه از مرغ و مرغ از بیضه ها
می برآری تا شود هستی گرا

یا ز نادانی، خدارا ناشناس
عالمی یزدان ستا و با سپاس

باز از دانا تو نادان آوری،
کو بدوری افتد از دانشوری

هر گرا خواهی تو روزی می دهی
بیش از اندازه و مقداری دهی[1]

هر چه خواهد عفو تو خود آن کند،
چاره آن جرم و آن عصیان کند

برزداید هر چه کردم از گناه
برکرانم آرد از کار تباه

لطف او نگزارد[2] دم در بند آز
تا نمانم بسته بند نیاز

جز تو معبودی نشد هستی گرا
بهر تو آریم تسبیح و ثنا

مر ترا دایم ستایش گستریم
در ستایشها نیایش آوریم

کیست آن کو را نجنبد حکم و توان
پس نیاید بیم تو او را بجان؟

کیست آن کو را نخواند هستی دانندت
پس ز تو نا ترسد و نا خواندت؟

از توان تست تالیف الفرق
باشد از رحم تو تفلیق الفلق

فرقه های مختلف یکجا کنی،
صبح را از تار شب پیدا کنی

تار شب را ساختی رخشنده رخت
آب را کردی رواں از سنگ سخت

آب را کردی دو گونه آشکار
یک بود شور و دگر شیرین گوار

از فشارنده که آن باشد سحاب
خود فرود آورده ریزنده آب

ساختی خورشید و مه را آشکار
در جهان مثل چراغ نوربار

بی ازاں کز احتمال رنج و درد
ماندگی آید ترا از کار کرد

ای یگانه! با همه عز و بقا
بندگان را پست کردی از فنا

ای خدای پاک و ای رب ودود!
از فرازیں بر فرود آور درود!

بر محمد مصطفیٰ و آل او،
آں گزیده گوهران پاک خو!

بشنو آوازم، پذیرا کن دعا
دشمنانم را نگرداں بهر فنا

از کرم، امید من کن استوار
ای کرا خوانندت پی کشف ضرا!

ای بعسر و یسر ما مولِ همه!
وی ز تو انجاح مسئولِ همه!

حاجت خود پیش تو آورده ام
ناگزیری بر تو عرضه کرده ام

پس به ناکامی مگردانم ز جود
از گزیده بخشش خود ای ودود!

ای دمشور، ای دمشور، مهرباں!
مهرباں تر از همه رحمت کناں!

یا الٰہی[3]! قلب من محجوب و تنگ
عقل من مغلوب و نفس من به ننگ

حرص من بود ست بر من چیره دست
کثرت عصیاں و طاعت اندک است

معترف آمد ز بانم در ذنوب
چیست تدبیر من؟ علام الغیوب؟

ای گنه آمرز و ستار العیوب!
عفو کن از من، ببخشایم ز ذنوب

ای بهنگام عقوبت سخت گیر!
وی بحلم و مغفرت پوزش پذیر!

حاجت من بهر قرآں کن روا!
وز برای حضرت خیر الورا!

ای خدا، از آسماں آور فرود!
بر نبی و آل اطهارش درود!

---

[1] اصل: مقدارش دہی۔ [2] اصل: نگذاردم۔ [3] یہاں سے امام زین العابدین علیہ السلام کی مناجات کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔

مُغل لائن لمیٹیڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن پورٹ سوڈان جدّہ و سوئز کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

بمبئی اور کراچی سے عدن جدّہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی ماریشس تک مسافروں اور باربرداری کی سروسیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں

تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے:

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹیڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ بمبئی

وقت کا سب سے بڑا مسئلہ

کس قدر عجیب بات ہے کہ دنیا جتنی ترقی کرتی جارہی ہے، امن وسکون اتنا ہی زیادہ مفقود ہوتا جاتا ہے اور انسان کی ذہنی وعلمی دستگاہ جس قدر وسیع ہوتی جاتی ہے، اتنا ہی زیادہ اختلاف دنیا میں بڑھتا جاتا ہے

جب تک دنیا میں مذہب کی حکومت رہی اس نے فتنہ وفساد برپا رکھا اور اب کہ علم وحکمت کی ترقیاں ہیں ان کے مظالم سے سر چھپانے کی فرصت نہیں۔ اس کے اسباب متعدد ہوسکتے ہیں، لیکن سب سے بڑا سبب جسے مرکزی حیثیت حاصل ہے یہ ہے کہ انسان ابھی تک کوئی قابل اطمینان اجتماعی نظام ایسا قایم نہیں کرسکا کہ تمام افرادِ انسانی ایک دوسرے کے ساتھ ملکر زندگی بسر کرسکیں

اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ تقسیم دولت کا ہے اور جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہوجائے دُنیا کو چین نہیں ملسکتا۔ انسان جب وحشی تھا تو غذا کے لئے لڑتا تھا اور اب کہ وہ مہذب وشایستہ ہوگیا ہے، اسباب عیش وتنعم کے لئے لڑ رہا ہے۔ الغرض اس نزاع کا سبب ہر زمانہ میں یہی رہا ہے کہ ایک کے پاس ضروریات وتنعمات حاصل کرنے کے ذرایع زیادہ ہیں اور دوسرے کے پاس کم اور جب تک اس تفاوت کو مٹاکر دنیا کے اقتصادی نظام میں کوئی خاص توازن نہ پیدا کیا جائے گا لڑائی برابر جاری رہے گی۔

پچھلی لڑائی کے بعد اشتراکیت وبالشویت کا ظہور بھی اسی اقتصادی کشمکش کا نتیجہ تھا اور موجودہ جنگ کے بعد بھی جو کچھ ہونا ہے وہ بھی اسی مسئلہ سے متعلق ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ غریب وامیر کی لڑائی قدیم زمانہ میں بھی پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ اب غربت وامارت میں بہت زیادہ تفاوت ہوگیا ہے اور امیر بہت زیادہ امیر اور غریب بہت زیادہ غریب ہوگیا ہے اس لئے یہ اختلاف بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

یہی وہ چیز تھی جس نے سب سے پہلے "مساوات" کا خیال پیدا کیا اور ہر چند سیاست، تعلیم اور مدنیت وغیرہ میں ایک حد تک مساوات پیدا ہوگئی ہے لیکن دولت میں ابتک وہی تفاوت پایا جاتا ہے۔

ایک طرف وہ طبقہ ہے جس کو لذیذ غذائیں، نفیس ملبوس، بڑے بڑے محلات، قیمتی موٹریں، اچھی صحتیں اور عزتیں حاصل ہیں، دوسری طرف وہ طبقہ ہے، جس کے پاس دکھانے کو غذا ہے، نہ پہننے کو لباس، نہ رہنے کو مکان ہے، نہ چلنے پھرنے کے لئے سواری صحت بھی خراب ہے اور عزت بھی مفقود۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دونوں طبقے ایک سطح پر کیونکر آسکتے ہیں اور نیچا طبقہ اونچے طبقہ سے کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دولت سب میں برابر تقسیم ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں؟

اگر انسانی افراد ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہوکر زندگی بسر کرتے ہوتے تو شاید یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا، لیکن چونکہ نظام تمدن میں ہر شخص دوسرے کا محتاج ہے اس لئے تقسیم دولت کا سوال بہت مشکل ہوگیا ہے۔

موجودہ نظام کی حالت ایک بازار کی سی ہے جس میں ہر وقت سودا ہوتا رہتا ہے اور جو چیز ہمارے پاس نہیں ہے، اسے

قیمت یا اُجرت پر دوسروں سے حاصل کرتے ہیں۔ پھر جب کسی چیز کی مانگ زیادہ ہوتی ہے تو اس کی قیمت بڑھا دیجاتی ہے اور جب مانگ کم ہوتی ہے تو قیمت گھٹ جاتی ہے۔

کاشتکار کا اپنی پیداوار فروخت کرنا۔ مکان کے مالکوں کا اپنے مکانات کرایہ پر دینا، ساہوکاروں کا سود پر روپیہ چلانا اور جنکے پاس روپیہ نہیں ہے ان کا اپنی جسمانی و ذہنی قوت پیش کرنا سب اسی قانون عرض وطلب (Supply + demand) کی وجہ سے ہے اور اسی نے اقتصادی مدوجزر پیدا کر رکھا ہے۔

پھر غور طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ قانون عرض وطلب ٹھیک ہے یا نادرست؟ ماہرین اقتصاد کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ قانون بالکل فطری قانون ہے اور جس طرح ہم فطرت کے دوسرے قوانین پر اعتراض نہیں کرسکتے اسی طرح اس پر بھی نہیں کرسکتے زمین کا ایک حصہ قدرت نے خشک رکھا، دوسرے کو پانی سے سیراب کر دیا، کہیں سردی زیادہ کردی کہیں گرمی زیادہ۔ تو کیا ہم اس پر اعتراض کرسکتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ پھر قانون عرض وطلب پر کیوں اعتراض کریں۔

ایک اور جماعت اس کو بالکل قرین انصاف بتاتی ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ چیزوں اور خدمات کی قیمت خود پبلک اپنی خوشی سے مقرر کرتی ہے اور یہ تمام سودا بغیر کسی جبر واکراہ کے ہوتا ہے اس لئے اس میں خلاف انصاف کوئی بات نہیں۔

لیکن ایک جماعت اس قانون کو خلاف انصاف قرار دیتی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ قانون بیشک دوسرے فطری قوانین کی طرح ہے، لیکن فطرت کے اور قوانین کب انصاف پر مبنی ہیں کہ اس کو قرین انصاف قرار دیا جائے۔ پھر انسان نے جس طرح فطرت کے اور تمام قوانین کو عقل سے کام لیکر اپنے موافق بنایا ہے اسی طرح اس قانون کو بھی بدلنا چاہئے۔

ایک کاشتکار ہماری زندگی کے لئے غلہ پیدا کرتا ہے، ایک خاکروب ہماری صحت کے لئے سڑکیں صاف کرتا ہے، لیکن اسے کیا ملتا ہے؟ شاید صرف اتنا کہ وہ زندہ رہ سکے، لیکن برخلاف اس کے ایک مشہور گانے والا، ایک مشہور شعبدہ باز، ایک مشہور پہلوان چند گھنٹے کے اندر سیکڑوں روپیہ حاصل کرلیتا ہے، درانحالیکہ ان میں سے کسی چیز کی ہم کو ضرورت نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ یوروپ میں کسی ملکہ نے ایک گانے والی کو بلایا، جب اس کی فیس دریافت کی تو معلوم ہوا کہ بہت زیادہ ہے۔ ملکہ نے کہا کہ جو کچھ تم مانگتی ہو وہ تو ملک کے وزیروں کو بھی نہیں ملتا۔ گانے والی نے جواب دیا: "تو پھر وزیروں سے کہئے کہ وہ گانا ہی سیکھیں"۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا کا موجودہ نظام "حقِ ملکیت" پر قایم ہے، لیکن یہ "حقِ ملکیت" کیا چیز ہے، اسے بھی سمجھ لیجئے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ انسان مجبور ہے کہ وہ اشیاء کو اپنے تصرف میں لائے اور یہی صورت چیزوں سے فایدہ اُٹھانے کی ہے۔ روٹی سے فایدہ اُٹھانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسے کھائے، کپڑے سے مستفید ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے پہنے، مکان سے فایدہ حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ وہ اس میں رہے اور زمین پر تصرف کا مقصود یہ ہے کہ کاشت کرے۔ لیکن اس سے "حق ملکیت" قایم کرنے کا خیال انسان کو کیوں پیدا ہوتا ہے۔

اس کے متعلق علماء اقتصاد مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ بعض حق ملکیت کو بالکل فطری حق ظاہر کرتے ہیں، لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر ملکیتیں چند آدمیوں کے لئے مخصوص ہوجائیں گی تو پھر اکثر آبادی اس سے کیونکر فایدہ اُٹھائے گی۔ اگر کہا جائے کہ وہ کرایہ، ٹھیکہ یا مزدوری کی حیثیت سے فایدہ اُٹھا سکتی ہے تو نتیجہ وہی ہوگا جو آجکل سرمایہ و عمل کی جنگ میں نظر آتا ہے اور امن وسکون پر بھی مفقود رہے گا۔

بعض کہتے ہیں کہ "حق ملکیت" عمل پر قائم ہے، یعنی ایک انسان کی محنت سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس پر حق ملکیت قدیم ہونا ہے اور قایم رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ کہنا واقعہ و حقیقت کے خلاف ہے۔ آپ امراء کی املاک پر غور کیجئے، کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان کی محنت کا نتیجہ ہے، کیا مکان جس میں وہ رہتے ہیں، خود انھوں نے تعمیر کیا تھا، کیا ان کے عیش و تنعم کی تمام چیزیں خود ان کی بنائی ہوئی ہیں۔ یقیناً یہ سب انھوں نے دوسروں کی محنت سے حاصل کیا اور اس محنت کا معاوضہ روپیہ سے دیا جو خود بھی انھوں نے اپنی محنت سے حاصل نہ کیا تھا۔

ایک اور فریق حق ملکیت کی طرفداری میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ یہ نظام سوسائٹی اور ہیئت اجتماعی کے لئے مفید ہے، کیونکہ اس طرح لوگوں کو زیادہ محنت و عمل کی رغبت ہوتی ہے اور اس طرح ملک کی دولت بڑھتی ہے۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں بن سکتے، تو پھر وہ جی توڑ کے محنت بھی نہ کریں۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے، لیکن اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے وہ غلط ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اگر حق ملکیت قایم کیا جائے تو اس کا تعلق کسی مخصوص فرد سے نہ ہونا چاہیئے بلکہ پوری جماعت کو اس سے فایدہ اُٹھانا چاہیئے، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ ایک کارخانہ کا ایک زمیندار، مزدوروں اور کاشتکاروں کی محنت سے جتنا فایدہ اُٹھاتا ہے اس کا نہایت ہی قلیل حصہ اُجرت کی شکل میں صرف کرتا ہے، باقی خود لے لیتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی دولت سے تمام ملک برابر کا فایدہ نہیں اُٹھاتا بلکہ چند مخصوص افراد اس سے متمتع ہوتے ہیں۔

اس وقت حق ملکیت کا یہ حال ہے کہ ایک انسان ہر قسم کی ثروت کو حاصل کر سکتا ہے لیکن قدیم زمانہ میں یہ صورت نہ تھی۔

اول اول حق ملکیت بعض مخصوص چیزوں تک محدود تھا اور وہ چیزیں ایسی تھیں جنھیں آجکل دولت و ثروت بھی نہیں سمجھا جاتا، مثلاً غلام اور عورت۔ پھر غلاموں اور عورتوں کے ساتھ زیور، اسلحہ اور مویشی بھی حق ملکیت میں شامل ہوئے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی آدمی مرتا تھا تو اسی کے ساتھ یہ چیزیں بھی دفن کر دیجاتی تھیں۔ اس کے بعد گھر کی ملکیت کا سوال پیدا ہوا، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے والوں کی روحیں اپنے گھروں میں آتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے پسماندگان مکان سے قطع تعلق کر کے اپنے آباء و اجداد کی روحوں کو پریشان نہ کر سکتے تھے۔

زمین کی ملکیت بہت بعد کی چیز ہے کیونکہ عبرانی زبان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے "زمین کی ملکیت" کا مفہوم ظاہر ہوتا ہو، لیکن ایک بار "زمین کی ملکیت" کا سوال پیدا ہونے کے بعد اس میں سختی بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ آج ملکیت کے مسئلہ میں سب سے اہم عنصر زمین ہی کا ہے۔

جدید قوانین میں ملکیت سے مراد "مطلق حق" ہے، یعنی مالک کو اختیار ہے کہ شے مملوکہ کو جس طرح چاہے کام میں لائے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اسے تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کرلے تو بھی کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ دوسری چیز ملکیت کا دوام ہے، یعنی جب تک وہ شے باقی ہے حق ملکیت بھی قایم رہے گا۔ الغرض "دوام اور تصرف" حق ملکیت کی ممتاز صفتیں قرار دیجاتی ہیں، لیکن ملکیت کا یہ مفہوم بھی رفتہ رفتہ قایم ہوا ہے۔

اول اول ایک شخص صرف ان غلاموں سے کام لے سکتا تھا جو اس کی ملکیت تھے، اس کے بعد وہ اُجرت دیکر دوسرے لوگوں سے بھی کام لینے لگا، پھر مالک کو اس بات کا بھی مستحق قرار دیا گیا کہ وہ اپنی ملکیت جس کو چاہے دے دلائے یا ہبہ کر دے۔

اس کے بعد فروخت کرنے اور ٹھیکہ پر دینے کا حق حاصل ہوا اور پھر مرنے کے بعد حق ملکیت باقی رکھا گیا، یہاں تک کہ اگر مرنے والا خود اپنی املاک کی تعیین نہیں کرتا تو قانون ملکیت متعین کرتا ہے۔

اب غور کیجئے کہ ان حقوق سے کیا خرابیاں پیدا ہوئیں۔ وراثت و ہبہ سے تو دولت بالکل عملی دنیا سے علٰحدہ ہو جاتی ہے کیونکہ پانے والا تو بغیر کسی محنت و کوشش کے اسے حاصل کر لیتا ہے اور آبادی کا بڑا حصہ اس سے محروم رہتا ہے۔

قرض یا اجارہ کی صورت میں انسانیت دو فریق میں منقسم ہو جاتی ہے داین و مدیون یا اجیر و مستاجر اور اگر دولت سے کام لیا جائے تو پھر سرمایہ دار اور مزدور دو طبقے علٰحدہ ہو جاتے ہیں۔ الغرض ملکیت کی تمام صورتیں ہیئت اجتماعی میں تفریق و انتشار پیدا کرنے والی ہیں۔

اب آیئے غور کریں کہ اس کا علاج کیا ہے اور حق ملکیت کو دور کرنے کے بعد اقتصادی نظام کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے متعلق ارباب نظر کا فیصلہ یہی ہے کہ دولت کو تمام آدمیوں میں منقسم ہونا چاہئے اور اسی کا نام اشتراکیت ہے۔ اشتراکیت کے متعلق مختلف رائیں ہیں اور متعدد نظریے اس باب میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ انتہا پسند نظریہ ہے جسے بالشویت کہتے ہیں، دوسرا وہ معتدل نظریہ ہے جو انگلو سیکسن اقوام نے پیش کیا ہے۔

اشتراکی مذاہب کی رو سے دولت کی تقسیم حسب ذیل صورتوں میں کی جا سکتی ہے:

(۱) تمام انسانوں میں اسے برابر برابر تقسیم کر دیا جائے

(۲) ہر شخص کی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے۔

(۳) ہر شخص کے استحقاق کے لحاظ سے اس کو بانٹا جائے۔

(۴) ہر شخص کے عمل کو سامنے رکھ کر اسکی تقسیم کی جائے۔

اب آیئے ان پر علٰحدہ علٰحدہ غور کریں:

پہلی صورت اشتراکیت کی بہت قدیم صورت ہے، چنانچہ اگلے زمانہ کے قانون سازوں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام افراد قبیلہ میں زمین برابر تقسیم کرتے تھے اور جب طویل زمانہ گزرنے کے بعد یہ مساوات باقی نہیں رہتی تھی تو پھر از سر نو تقسیم ہوتی تھی۔ لیکن اب اس تقسیم پر عمل نہیں ہو سکتا، کیونکہ پہلے تو دولت و ثروت صرف زمین پر منحصر تھی اور اب اس کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس لئے موجودہ زمانہ کے اشتراکیت پسند دنیا کی تمام دولت و ثروت کی برابر تقسیم تو نہیں چاہتے، لیکن وہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ امراء کو ان کی دولت سے محروم کر کے غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اگر اس پر عمل کیا جائے تو کیا نتیجہ ہوگا، اس پر بھی غور فرمایئے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں امیروں کی تعداد بہت کم ہے، اتنی کم کہ اگر ان کی دولت کو غریبوں میں تقسیم کیا جائے تو بالکل وہی حال ہوگا جیسے آپ کسی حوض میں ایک پیالہ پانی کا ڈال دیں۔ مثلاً آپ فرانس کو لیجئے کہ اگر وہاں کے تمام ترکوں کو جن کی قیمت فی ترکہ ۴۰ گنی سے زیادہ ہے تمام فرانس کے باشندوں پر تقسیم کیا جائے تو ہر شخص کو سالانہ ۴۰ فرانک سے زیادہ آمدنی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر انگلستان کے ترکوں کو جن کی قیمت فی ترکہ ۵۰ ہزار گنی سے زیادہ ہے برابر برابر انگلستان کی آبادی میں تقسیم کیا جائے تو فی کس سالانہ ۸۱ فرانک سے زیادہ آمدنی نہ ہوگی اور یہ اتنی حقیر رقم ہے کہ ضروریات زندگی کے لئے بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ چہ جائیکہ خوشحالی!

(۲) اب دوسری صورت کو لیجئے، یعنی ضرورت کے لحاظ سے دولت کی تقسیم۔ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو جتنی ضرورت ہو اتنی دولت ان کو ملجایا کرے۔

یہ اشتراکیت کا نہایت قدیم خیال ہے اور زندگی کے پہلے دور میں انسان دولت سے اسی طرح فایدہ اُٹھاتا تھا اور اب بھی مشترکہ خاندانوں میں اس کا رواج ایک حد تک پایا جاتا ہے۔ درمیان میں یہ خیال کچھ مٹ سا گیا تھا کہ اشتمالیت پسندوں نے پھر اس کو زندہ کیا۔ اس مذہب کے اُصول یہ ہیں کہ انسان چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنائے اور جماعت کے تمام افراد دولت و ثروت سے حسب ضرورت فایدہ اُٹھائیں۔

اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ موجودہ دولت و ثروت لوگوں کی تمام حاجتیں پوری کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ضرورتیں اسی نسبت سے پیدا ہوتی ہیں جس نسبت سے وہ پوری ہوتی ہیں، اس لئے یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ فلاں شخص کی فلاں ضرورت پوری کرنے کے قابل ہے یا نہیں، کسی حاکم کی ضرورت ہوگی۔ اشتمالیت پسند کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ آپس کی رضامندی سے طے ہو سکتا ہے لیکن یہ فطرتِ انسانی کے بالکل خلاف ہے۔

ہر چند انسان نے عہدِ قدیم میں اسی اُصول پر زندگی بسر کی ہے اور اب بھی امریکہ میں بعض جماعتیں وہاں کے قدیم باشندوں کی ایسی پائی جاتی ہیں جو اسی اُصول پر کاربند ہیں، لیکن اس کو عام تجربہ میں لانے کے لئے بعض شرطوں کا خیال ضروری ہے۔

سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ جماعتیں زیادہ سے زیادہ ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہوں۔ کیونکہ ایک جماعت میں جتنے کم افراد ہوں گے اتنی ہی زیادہ اجتماعیت ان میں پیدا ہو سکے گی، لیکن تمدن کے موجودہ دورِ ترقی میں یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ نوعِ انسانی چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہو کر اپنے آپ کو کفیل بالذات بنائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سوسائٹی کا نظام قایم کرنے کے لئے جماعت کے افراد کو خاص خاص قوانین کی پابندی کرنا پڑیگی اور اشتمالیت پسند اس کو گوارا نہیں کرتے کہ انسان کی شخصیت پر کوئی خارجی دباؤ ڈالا جائے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ استحقاق کے لحاظ سے دولت تقسیم کی جائے۔

اس باب میں حکماء کے متعدد اقوال پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور فرانس کے علماء فوریہ، سان سیمون، لوئس بلان اور پرودون ہیں

فوریہ کا خیال تھا کہ مختلف جماعتوں کو ملکر ایک وحدتِ اجتماعی بنانا چاہئے اور عمل میں سب کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ اس نے اُجرتوں کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پانچ حصے مزدور کے لئے، چار سرمایہ دار کے لئے اور تین حصے مہارت رکھنے والوں کے لئے ——— لیکن اگر اس پر عمل کیا جائے تو بھی مساوات باقی نہیں رہتی جو اشتراکیت کی غایت اصلی ہے

سان سیمون کے اصول پر پچھلی صدی میں بہت زیادہ عملاً ظاہر کیا گیا اور اس کے بہت سے متبعین فرانس وغیرہ میں پیدا ہو گئے۔ اس نے یہ اُصول پیش کیا تھا کہ صاحب ثروت اور کام کرنے والے دونوں کے لئے حکومت کی طرف سے وظایف مقرر کئے جائیں جس کا تعین ان کی اہلیت کے لحاظ سے ہونا چاہئے اور اہلیت کا اندازہ اس فایدہ کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے جو انکی ثروت و عمل سے حاصل ہوتا ہے اس طرح مساوات تو خیر پیدا نہیں ہوتی، لیکن حق وراثت اور حق ملکیت البتہ دونوں

ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تمام تحریکات سے کوئی اور فایدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن یہ ضرور ہوا کہ مختلف قسم کی تعاونی (Co-operative) سوسائٹیاں قایم ہوگئیں۔ مزدوروں کی علٰحدہ، اہل حرفہ کی علٰحدہ، کاشتکاروں کی جُدا اور اس سے مختلف طبقات میں اجتماعی حیثیت سے آگے بڑھنے اور مسابقت (Competition) کی اہلیت زیادہ پیدا ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ سرمایہ داروں پر بھی دباؤ پڑا کہ وہ مزدوروں کی اصلاح حال اور اُجرت بڑھانے پر توجہ کریں۔

(۴) چوتھا مذہب یہ تھا کہ کام کے لحاظ سے دولت تقسیم کی جائے۔ اس سے مراد یہ تھی کہ دولت پیدا کرنے کے تمام ذرایع کسی خاص شخص یا جماعت کی ملکیت نہ قرار پائیں۔ اس مذہب کا نام "Collectivism" ہے۔

اشتراکیت کا یہ مذہب دوسرے مذاہب سے اس لئے ممتاز ہے کہ یہ ایک علمی بنیاد رکھتا ہے اور اسی لئے اس کے متبعین اس کا نام "اشتراکیت علمی" رکھتے ہیں۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ اگلے زمانہ میں ملکیت انفرادی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ محنت بھی انفرادی تھی۔ ایک ہی شخص محنت کرتا تھا اور اس سے فایدہ اُٹھاتا تھا، لیکن اب کہ کوئی صنعت و تجارت بغیر بہت سے آدمیوں کی مدد کے کامیاب نہیں ہوسکتی، سب کو فایدہ حاصل کرنا چاہئے اور انفرادی ملکیت کی جگہ اجتماعی ملکیت کو لے لینا چاہئے۔

کمیونزم اور اس مذہب میں یہ فرق ہے کہ وہ عمل کے ذرایع و نتائج دونوں کی تقسیم سب میں برابر کرنا چاہتی ہے، لیکن یہ تمام ذرایع عمل و نتائج کو برابر برابر بانٹنا نہیں چاہتی۔ اگر کوئی شخص تنہا کام کرتا ہے تو اس کو تنہا فایدہ اُٹھانا چاہئے، لیکن جو کام اجتماعی حیثیت سے کئے جاتے ہیں، اُن کا فایدہ البتہ سب کو برابر اُٹھانا چاہئے۔

اس مذہب والوں کا دعویٰ ہے کہ اس طرح ہر شخص کی آزادی قایم رہ سکتی ہے، لیکن ہمارے خیال میں یہ دعویٰ بے بنیاد ہے، کیونکہ انفرادی حیثیت سے فایدہ اُٹھانے والا بھی اپنی دولت کو ان کے قانون کے مطابق کسی ایسے کام میں نہیں لگا سکتا جو نفع بخش نہیں ہے اور اس طرح وہ تصرف حقیقی سے محروم رہتا ہے۔

اس مذہب کے مدعی یہ بھی چاہتے ہیں کہ کارخانوں پر کام کرنے والوں کا غلبہ ہو جائے، لیکن یہ بات بھی خسرہ سے خالی نہیں کیونکہ مزدوروں کی نظر زیادہ وسیع نہیں ہے اور نہ وہ اقتصادی قوانین کو سمجھ سکتے ہیں۔

ان کا مطالبہ یہ بھی ہے کہ ہر مزدور کو کام کے گھنٹوں کے لحاظ سے اُجرت دیجائے، حالانکہ اصولاً یہ ہونا چاہئے کہ کام کے نتیجہ کے لحاظ سے اُجرت دیجائے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک مزدور کاہل و نااہل ہو اور وہ ۲۴ گھنٹے میں بھی اتنا کام نہ کرسکے جتنا دوسرا آٹھ گھنٹے میں کرتا ہے۔

بہرحال اس وقت سرمایہ و عمل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوگیا ہے اور جس طرح سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی حفاظت کی فکر میں ہیں اسی طرح مزدوران کے سرمایہ سے زاید از زاید فایدہ اُٹھانا چاہتے ہیں اور یہ کشمکش یقیناً ایک بار موجودہ اقتصادی نظام کو درہم برہم کردے گی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے، کیونکہ اصل سوال دنیا کے امن و سکون کا ہے، اور یہ مدعا صرف اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے، جب دنیا سے "مادیت" ختم ہو جائے اور اس کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

اقبال شاعر کی حیثیت سے

(اڈیٹر نگار کی دس منٹ کی تقریر بروز یوم اقبال (۲۱ اپریل) کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی)

اس میں شک نہیں کہ اقبال ہماری زبان کا پہلا شاعر ہے، جس نے ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ شاعر کا کوئی پیام بھی ہوا کرتا ہے، اور اس کا تعلق ہماری اجتماعی زندگی سے بھی ہو سکتا ہے۔

اقبال سے پہلے شاعری نام تھا صرف غزل گوئی کا جس میں صرف حسن و عشق کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا یا تصوف کے اُن چند مخصوص مصطلحات کا جن کے صحیح مفہوم سے شاید خود شاعر بھی ناواقف ہوتا تھا، لیکن جب حالی، اسماعیل اور محمد حسین آزاد نے قدیم غزلگوئی کا رنگ بدل کر اس میں زندگی کی بعض سنجیدہ حقیقتوں کو بھی شامل کر لیا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ وصل و فراق کے جھگڑوں کے علاوہ انسان کو دنیا میں اور بھی بہت کچھ سوچنا سمجھنا ہے اور غزل گوئی کے اسی جدید مشرب کا ارتقاء اکبر و اقبال کی شاعری تھی۔

اقبال کی شاعری کا آغاز داغ کی شاگردی سے ہوتا ہے جو خود قدیم طرز کا غزل گو تھا، لیکن اقبال نے ابتدا میں بھی کبھی داغ کی شاگردی کا حق ادا نہیں کیا اور بعد کو تو خیر لوگوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ اقبال و داغ میں باہم کوئی تعلق تھا بھی یا نہیں۔

اقبال کی شاعری کے تین کھلے ہوئے دور ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جب ان کا کلام مخزن میں شایع ہوا کرتا تھا اور انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں وہ اپنے قومی مسدس پڑھا کرتے تھے، اس وقت وہ غزلیں بھی کہتے تھے اور نظمیں بھی، لیکن ان کی غزلوں میں بھی ہم کو بعض چونکا دینے والی باتیں نظر آتی تھیں اور نظموں میں بھی زیادہ گرم و تیز چنگاریاں پائی جاتی تھیں۔

اقبال سے پہلے تغزل میں ہم کو اخلاقی مواعظ تو کہیں کہیں نظر آجاتے تھے، لیکن اجتماعی و سیاسی اشارے بالکل مفقود تھے اس کی ابتدا اقبال نے کی، چنانچہ ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی ہم کو اس قسم کی باتیں نظر آجاتی ہیں کہ:

رہنے دو خُم کے منہ پر تم خشت کلیسیا ابھی

گو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اقبال کے سیاسی نظریے واقعی قابل تقلید بھی تھے،

اقبال کے پہلے دور کی شاعری حقیقتاً محاکاتی یا نقاشانہ شاعری تھی، جو بعد کو زیادہ نمایاں ہوتی گئی، یہاں تک کہ آرٹ کی جگہ سائنس نے لیلی اور اقبال کا اجتماعی و سیاسی نظریہ ایک مابہ النزاع مسئلہ بن گیا۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور ترانہ اور شکوہ پر ختم ہوتا ہے۔ ترانہ تو خیر وطنی حیثیت سے نہیں، قومی حیثیت سے مکمل چیز تھا بشرطیکہ اس سے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" نکال دیا جاتا، لیکن شکوہ، صرف "جواب شکوہ" کے لئے لکھا گیا تھا اور یہیں سے اقبال کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جب انھوں نے خودی کا نظریہ پیش کر کے خراج تحسین بھی حاصل کیا

اور وہ ہدفِ ملامت بھی بنے۔

خودی کا نظریہ کوئی نئی چیز نہ تھا، لیکن اقبال نے جس زمانہ اور جس رنگ میں اسے پیش کیا وہ ضرور چونکا دینے والا تھا۔ یعنی اقبال نے اسے ایسے زمانہ میں پیش کیا جب ملک کی غلامی اپنے انتہائی دور سے گزر رہی تھی اور انداز و ادا اختیار کیا جس میں ادب تصوف اور فلسفہ سب ملے جلے نظر آتے تھے اور اسی لئے وہ ہر جماعت میں غور کے ساتھ سُنا گیا۔

یہ بیان بہت تفصیل چاہتا ہے کہ فلسفۂ خودی کی طرف اقبال کی رہنمائی کیونکر ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے شرق و غرب کے قدیم و جدید تمام حکماء کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور یقیناً وہ ان سب سے متاثر ہوئے ہوں گے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس قسم کا تاثر ایک شخص کو اقبال ہی بنا دے، یقیناً اقبال خود اپنے اندر ایک خاص ذوق فلسفہ کا رکھتے تھے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں — پوشیدہ ہے ریشہائے دل میں

اقبال نے صوفیہ میں سنائی، عطار، رومی، ابن عربی کا، مغربی حکماء میں ہیگل، اسپنوزا، شوپنہار اور نیٹشے کا اور فارسی شعراء میں زیادہ تر خاقانی اور بیدل کا مطالعہ کیا تھا، لیکن غالباً انھوں نے اثر قبول کیا صوفیہ میں ابن عربی کا، حکماء میں نیٹشے کا اور شاعروں میں بیدل کا اور اگر ان تینوں کو ملا کر ہم کوئی چیز پیش کر سکتے ہیں، خواہ اس میں جا بجا اختلاف و تضاد ہی کیوں نہ پایا جائے تو اس کا نام اقبال کی شاعری رکھا جا سکتا ہے۔

اقبال کے فلسفۂ خودی کے متعلق لوگوں نے بہت کچھ رائے زنی کی ہے، لیکن خود اقبال نے اس کی بہترین تفسیر پیامِ مشرق میں اس طرح کی ہے:

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم — ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم

موج ز خود رفتۂ تیز و خرامید و گفت — ہستم اگر می روم، گر نہ روم نیستم!

فلسفۂ خودی، تصوف کے نقطۂ نظر سے وحدت فی الکثرت ہو یا کثرت فی الوحدت، لیکن زندگی پر مطابق ہونے کے لحاظ سے وہ صرف "حرکت و عمل" ہے اور اسی راز کو مختلف انداز سے اقبال نے اکثر جگہ ظاہر کیا ہے:-

اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز — کہ ترا کار بہ گرداب و نہنگ ست ہنوز

از سر تیشہ گزشتن ز خرد مندی نیست — اے بسا لعل کہ اندر دلِ سنگ ست ہنوز

جاوید نامہ میں اقبال کی خودی زیادہ وسعت اختیار کر جاتی ہے یعنی اس سلسلہ میں وہ بعض اور اجتماعی و سیاسی مسایل پر بھی روشنی ڈال جاتے ہیں۔

جاوید نامہ کے بعد بالِ جبریل کی اشاعت ہوئی، اس کے بعد ضربِ کلیم کی اور یہ سب اقبال کی شاعری کے تیسرے دور کی چیزیں ہیں۔ اس سے قبل کی تصانیف میں ادبیت کا رکھ رکھاؤ بتاتا تھا کہ اقبال نے خاص طور پر اس کا خیال رکھا ہے اور خود انھیں اپنے نظریہ پر اعتماد ہو یا نہ ہو، لیکن دُنیا کے احساس پر زیادہ اعتماد نہیں، لیکن ضربِ کلیم میں وہ اس خیال سے گزر جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ جذبات زبان کے تابع رہیں، زبان جذبات کی تابع ہو جاتی ہے۔ اسی لئے بعض کا خیال ہے کہ ضربِ کلیم ادبی حیثیت سے گری ہوئی چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کی زبان اور جدت بیان ابتداء ہی سے ایک افسوں کا حکم رکھتی تھی اور لوگ زیادہ تر اسی سے متاثر ہوتے تھے، اس لئے ضرورت تھی کہ حقیقت کے چہرہ کو بے نقاب بھی پیش کیا جاتا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ اقبال خود

اپنے اس آرٹ سے تھک گئے ہوں یا یہ کہ انھوں نے واقعی اس کی ضرورت محسوس کی ہو، بہرحال جو سبب بھی رہا ہو، اس میں کلام نہیں کہ ضربِ کلیم میں شعریت و موسیقیت کی لاگ بہت کم نظر آتی ہے اور اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بہت صاف صاف ہے۔

ارمغانِ حجاز اس سے بھی بعد کی چیز ہے جس میں یقیناً بالِ جبریل کی سی بلند پرواز ہے اور نہ جاوید نامہ کی سی پاکیزہ تخیل لیکن ضربِ کلیم کی سی چوٹیں ضرور ہیں، گو ایک حد تک تھکی ہوئی!

اقبال کی شاعری کے تیسرے دور میں غایت و مقصود کے لحاظ سے تو ہمیں کوئی نئی بات نظر نہیں آتی، لیکن اسلوب ادا کے لحاظ سے اس میں حکیمانہ پختگی ضرور پائی جاتی ہے جو اہلِ مذہب، اربابِ سیاست اور صاحبانِ تصوف سب کے لئے کچھ نہ کچھ تحیاں اپنے اندر رکھتی ہے۔

اقبال کی تمام شاعری کا محرک اصلی صرف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ذہن میں انسان کا ایک بلند تصور قایم کیا اور اس کا نام انھوں نے مردِ مومن رکھا "جس کی نگاہ سے تقدیریں پلٹ جاتی ہیں" اور اس مردِ مومن کی تفسیر و وضاحت انھوں نے مختلف عنوانوں سے کی ہے۔

مردِ مومن سے مراد اقبال کی کوئی ایسی معیاری ہستی نہیں جس کا تعلق ساری کائنات سے ہو بلکہ ان کی مراد صرف مسلمان سے ہے اور جس کی تعمیر میں انھیں صرف چار عناصر "قہاری و جباری و قدوسی و جبروت" نظر آتے ہیں، یعنی چار میں تین عنصر جلالی اور صرف ایک جمال اور اقبال کی شاعری یا فلسفہ کا یہی وہ پہلو ہے جس نے اقبال کو "اسلامی شاعر" کے حدود سے آگے بڑھکر آفاقی یا کائناتی شاعر بننے سے باز رکھا اور جس کو ہمیشہ افسوس کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اقبال کے پیام میں ہم کو محبت کی نرمی اور لچک کی جگہ ایک مادی کرختگی، ایک خود غرضانہ خشونت نظر آتی ہے، ان کے خیال کی انتہائی پرواز حجاز و سرزمینِ حجاز کے اُس دور سے آگے نہیں بڑھتی جس کا تعلق زیادہ تر "تلواروں کی چھاؤں" سے تھا، اور وہ اسی مسلمان کو انسانیت کی ترقی کا سب سے زیادہ نمایاں (Symbol) قرار دیتے ہیں جو قیصر و کسریٰ کی مملکت فتح کرنے کے لئے اُٹھا تھا۔

ہرچند مسلمان کی جو تعریف انھوں نے بیان کی ہے وہ اُصولاً ہر فرقہ کے لئے قابلِ تقلید و اتباع ہو سکتی ہے، لیکن حرکت و عمل کے اس پیکر میں قدوسیت کا عنصر انھوں نے اتنا کمزور رکھا کہ بجائے نرمی و ملاطفت کے وہ دُنیا کو مسابقت و منافست کا پیام دیتا ہے جو انسانیت کی تباہی کا محرکِ اصلی ہے۔

اقبال کے یہاں شاہین و عقاب کا رنگ اس قدر تیز ہے کہ امن و صلح کی فاختہ کا گزر وہاں ہو ہی نہیں سکتا اور اسی لئے اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کا مردِ مومن نٹشے کا فوق البشر (Super man) ہے تو یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا۔

ہرچند اقبال اسوقت کے ملاؤں، صوفیوں اور علمبردارانِ مذہب کے بتوں کو توڑ دینے کا درس دیتے ہیں، لیکن مکر و فریب جمود و بیحسی کے ان بتوں کو توڑ کر وہ جس نئے ہیکل کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں وہاں بھی ہم کو زیادہ تر چنگیزی ہی نظر آتی ہے۔

سیاسیات کے سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ یقیناً قیصریت و ملوکیت کے خلاف ہے، انھوں نے سرمایہ و عمل کی جنگ میں بھی سرمایہ داری کی مخالفت کی ہے، لیکن عہدِ حاضر کی سیاستِ "دیو بے زنجیر" کا علاج جو کچھ انھوں نے بتایا ہے اس کا ماحصل بھی صرف اسی قدر ہے کہ خود اس دیو کی جگہ لے لیجائے نہ یہ کہ اس دیو ہی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔

اقبال کی تعلیمات میں ہم کو جا بجا تضاد و ناہمواری بھی نظر آتی ہے، لیکن یہ ناہمواری اس حد تک نہیں پہونچتی کہ اقبال کا نقطۂ نظر بدلا ہوا نظر آئے، لیکن آخر آخر سب سے بڑا تغیر جو اقبال کی آیندہ شاعری پر بہت بڑا اثر ڈالنے والا ثابت ہوتا اور جس پر لوگوں نے بہت کم توجہ کی ہے، یہ تھا کہ وہ اپنے عمر کے آخری حصہ میں حدودِ عقل سے گزر جانے کا درس دینے لگے تھے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

اور علم پر عشق کو ترجیح دیتے تھے

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُم الکتاب

اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی حقیقی شاعری کا آغاز یہیں سے ہونے والا تھا اور یہی وہ منزل تھی جس سے گزرنے کے بعد وہ نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ ساری دُنیا کے شاعر تسلیم کئے جاتے، لیکن افسوس ہے کہ ان کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور مستقبل کا اقبال، حال کے اقبال میں گُم ہو کر رہ گیا!

ہندوستان کا دل اُس کے دیہات میں ہے۔ اس دل کی دھڑکنیں۔ نوجوان جذباتی شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی

چوپال

میں دیکھئے۔ یہ چودہ افسانوں کا مجموعہ پنجابی دیہاتوں کے مناظر اور دیہاتوں کی روحوں کی تصویروں کا البم ہے جسکے متعلق مشاہیر کی آرا ملاحظہ فرمائیے

عبدالمجید سالک: ندیم جو کچھ لکھتا ہے اپنے براہ راست مشاہدہ و احساس سے لکھتا ہے اسکی نظر فطرتِ انسانی کی گہرائیوں کو بالکل بے نقاب دیکھتی ہے اور وہ ہو بہو اُن کی عکاسی کر دیتا ہے۔ میرے نزدیک ندیم آیندہ دور کا بہترین شاعر اور افسانہ نگار ہے۔

امتیاز علی تاج: ندیم خود دیہات سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کسی خارجی نقطۂ نظر سے دیہات کو نہیں دیکھتا بلکہ نہایت بے تکلفی سے دیہات کو دیہات کے نقطۂ نظر سے منکشف کرتا ہے۔ اُردو ادب مستقبل کے ایک بڑے مصنف سے روشناس ہو رہا ہے۔

اختر شیرانی: ندیم کے تمام افسانے طبعزاد ہوتے ہیں اور اچھے بھی۔ اُنھیں دیہاتی معاشرت کا خاص تجربہ ہے اور یہ تجربہ اُن کے افسانوں کے حق میں معاون خاص ثابت ہو رہا ہے۔

کرشن چندر ایم۔ اے: آج سے آپ ہندوستان بھر کے افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں ہیں۔ آپ کے افسانے آرٹ اور واقعیت کا حسین ترین امتزاج ہیں۔

سعادت حسن:۔ اس قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے افسانے اُردو میں بہت کم شایع ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ [illegible] ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانوں کے موضوع کو آپ نے صرف محسوس ہی نہیں کیا بلکہ چھو کر بھی دیکھا ہے۔ یہ خصوصیت ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کو نصیب نہیں۔

کتابت دیدہ زیب۔ چھپائی عمدہ۔ کاغذ نفیس

مجلد قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ: دارالاشاعت پنجاب لاہور

دھوکا

(افسانہ)

باجے کی آواز انل کے کانوں میں آرہی تھی۔ کیسا سریلا باجا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "بچے راستے میں کھیلتے کھیلتے رک گئے ہونگے جوانوں کے دلوں میں یہ آواز امنگیں پیدا کر رہی ہوگی، بوڑھے بھی اپنی جوانی کا زمانہ یاد کر کر کے لطف اُٹھا رہے ہوں گے"۔ انل کے دل میں یہ آواز نشتر کی طرح چبھ رہی تھی۔ اس نے دروازے بند کر لئے، مگر پھر بھی جس طرح دھوپ چھن چھن کر شیشوں میں سے اندر آجاتی ہے اسی طرح سے آواز بھی اندر آرہی تھی۔ مگر وہ اب ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے گوشت کے اندر کوئی دھیرے دھیرے نشتر چبھو رہا ہو۔

باجے کی سریلی آوازیں وہ کسی کے رونے کی آواز بھی سُن رہا تھا وہ باجے جو دو ہستیوں کو ایک دوسرے سے ملا دینے کی خبر دنیا کو سُنا رہے تھے، جدائی کا راگ بھی الاپتے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ ایسا خیال کر رہا تھا کہ باجے اس پر ہنس رہے ہیں اس کی زندگی پر طنز کر رہے ہیں۔

یہ خیال کر کے وہ تلملا اُٹھا۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کا خیال کرنے لگا ـــــ اس نے سرد آہ بھری! آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ مگر اس نے ان کو کُرتے کی آستین سے پونچھ ڈالا۔

کسی نے کواڑ کھٹکھٹائے ـــــ دوبارہ کواڑوں پر دستک ہوئی۔ انل خاموش بیٹھا تھا اور خاموش ہی رہنا چاہتا تھا مگر دروازہ کی دستک بند نہیں ہوئی ـــــ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح کمرہ کی تنہائی اسے نگل لے اور وہ دُنیا کی نگاہ سے اوجھل ہو جائے۔ لیکن دستک کی آواز بند نہ ہوئی اور پھر کسی نے اس کا نام لیکر پکارنا شروع کیا۔ وہ جان گیا کہ یہ آواز کس کی ہے، مگر وہ سوچنے لگا کہ آج وہ اس کے گھر پر کیوں آیا! اس کے ماں، باپ نے تو اس سے کہدیا تھا کہ اگر اب انل کے گھر جاتا دیکھیں گے تو تیری ٹانگ توڑ دیں گے۔ پھر وہ کیوں انل کے گھر پر آیا۔

انل نے کواڑ کھول دئے!

شیل کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کوئی بات آآکر رہ جاتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں انل کے چہرہ پر دوڑائیں۔ وہ سوچکر آیا تھا کہ آج انل بہت اُداس ہوگا کیونکہ آج اس کی آرزوؤں کا خون ہو رہا ہے۔ کیونکہ آج اس کی پریا اپنے گھر سے رخصت ہو رہی ہے، لیکن وہ اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

شیل خیال کر رہا تھا کہ وہاں آنا اس کا فضول ہی ہوا اور پریا نے واقعی دھوکا کھایا اس نے سوچا کہ وہ بغیر کچھ کہے

وہاں سے چلا جاوے۔ مگر نہیں!۔ اس نے خیال کیا کہ بعض پہاڑ بھی بظاہر ایسے ہی خاموش نظر آتے ہیں مگر ان کے اندر آگ ہی آگ ہوتی ہے! ممکن ہے انل کے دل کا بھی یہی حال ہو اور یہ سوچ کر اس نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ انل نے شیل کی طرف سے نگاہ ہٹالی اور شیشوں کے باہر دیکھنے لگا۔

شیل: "میں تمھیں بلانے آیا ہوں۔ انل"

انل نے شیل کی طرف دیکھا اور تعجب سے پوچھا "کیوں"

ایک سال سے زیادہ زمانہ ہوا کہ انل نے شیل کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا۔ پھر انل اسے کیوں بلانے آیا۔ وہ شیل کا منہ دیکھ رہا تھا تاکہ کچھ جواب دے مگر کیا جواب دے یہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

شیل نے کچھ انتظار کے بعد کہا "پریما کا بیاہ ہے ۔ یہ تو تمھیں معلوم ہے؟"

انل نے رُکتے ہوئے جواب دیا: "معلوم تو ہوا تھا"

شیل: "تم ایک روز بھی نہیں آئے"

انل کا سر اس سوال پر چکرانے لگا، وہ سوچنے لگا کیا میں اپنی دُنیا کو اُجڑتے ہوئے دیکھنے کے لئے وہاں جاتا۔۔۔۔۔

مگر اس نے سنبھل کر کہا: "ہاں نہیں آیا، نہیں آسکا"

شیل: کیوں نہ آسکے ۔۔۔۔ سب نے تمھیں پوچھا اور ماں نے بھی کہا کہ کیا انل نے ہم لوگوں کی محبت بالکل ہی چھوڑ دی ہے!

انل بولا: "میں نے محبت ہی کب کی تھی۔ جس کو میں چھوڑ دیتا!" انل آگے کہتا کہتا رک گیا تاکہ شیل کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ ماں کے طعنے کو دہرا رہا ہے

شیل: "آج تو چلو، پھر تو پریما چلی ہی جاوے گی۔ آج سے وہ ہماری نہیں رہے گی۔ ہمارا اس کے اوپر زور نہیں رہے گا۔ پریما روزانہ تمھاری راہ دیکھتی ہے۔ جب تم نہیں آئے تو اس نے مجھکو یہاں بھیجا تاکہ وہ آخری مرتبہ تم کو دیکھ لے!!"

یہ سُنکر وہ بیتاب ہوگیا اور جی میں آیا کہ دونوں ہاتھوں سے وہ شیل کا منہ بند کر دے مگر جیسے مچھلی پانی سے باہر تڑپ تڑپ کر مرجاتی ہے اسی طرح سے اس کا دل بھی تڑپ کر رہ گیا!

وہ سوچنے لگا کہ وہاں کون کون ہوگا۔ میرے جاننے والے بھی ہوں گے اور نہ جاننے والے بھی! جاننے والے میری طرف انگلیاں اُٹھائیں گے اور نہ پہچاننے والے کانا پھوسی کریں گے۔ "یہ کون ہے، آج تک تو اس کو یہاں دیکھا نہیں! پھر کیوں آیا" اور اگر کسی پہچاننے والے نے نمک مرچ لگا کر میری تعریف کر دی اور موڑ توڑ کر میرے یہاں آنے کا مقصد ظاہر کر دیا تو میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ جاوے گا۔۔۔ اور پھر اگر کسی کا شک پریما پر ہوا، تو وہ کہیں کا نہ رہے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نہیں جاوے گا، جس طرح وہ آج تک اپنے کمرہ میں پڑا رہا ہے اب بھی پڑا رہے گا اور روتا رہے گا، جس طرح لوگ اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ انل کے دل میں پریما کی محبت صرف ظاہری تھی، اُسی طرح اب بھی ان کو سمجھنے دے گا۔ اور پریما کی خوشی کو برباد نہیں کریگا۔

باجے کی آواز زیادہ تیز ہوگئی۔ باجے والوں کو بھی شاید ضد ہوگئی تھی کہ انل نہ سننے کی جتنی کوشش کرے گا اتنا ہی وہ زیادہ تیز بجادیں گے۔ انل کے دل میں اسوقت ایک بھیانک شور و غل مچا ہوا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی اس کے دل پر لگاتار چوٹ مار رہا ہے!۔ وہ سوچ رہا تھا: ۔۔۔ شیل ابھی گھر نہیں پہونچا مگر اس کے دل میں میری طرف سے کیا خیال آرہا ہوگا ۔۔ یہی کہ بلانے پر بھی نہیں آیا۔ کبھی اس نے شیل سے اپنے دل کی باتیں کھول کھول کر کہی تھیں۔

اور جبھی پے شیل اور انل ایک ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ انل شیل کے ساتھ اس کے گھر پر جایا کرتا اور وہاں پریما بھی لجاتی تھی مگر جب انل اور پریما کی محبت کا چرچا ہونے لگا تو پریما کی ماں غصہ سے لال ہوگئی۔ وہ بہت بوڑھی تھی، اس نے زمانہ دیکھا تھا، اسکو ساٹھ برس کا تجربہ تھا وہ سمجھتی تھی کہ محبت ایک بلا ہے! اور اس بلا میں پڑنا کنواری لڑکیوں کا کام نہیں!!

اس کا نظریہ یہ تھا کہ لڑکیوں کو بیاہ تک اپنے گھر میں بالکل خاموش پڑا رہنا چاہئے، اور اپنے دل کو محبت ایسی گندی چیز سے صاف رکھنا چاہئے، ان کو زیادہ بات نہیں کرنا چاہئے، ان کو صرف گھر کا کام ہی کرنا چاہئے، ان کو اپنے دل کی بات ظاہر کرنے کا کوئی حق نہیں — اور بیاہ کے بعد ان کو اپنے پتی کا ہو کر رہنا چاہئے۔ کسی دوسرے مرد کی شکل بھی نہ دیکھنا چاہئے وغیرہ وغیرہ — بوڑھی کی رائے ماننے کے قابل تھی کیونکہ وہ برسوں سے دیکھتی آئی تھی کہ ایسے ہی لڑکیاں رہتی ہیں اور اب بھی ایسے ہی کیوں نہ رہیں!! — اس نے اپنے بچوں کو بتایا تھا کہ محبت دھوکے کی چیز ہے — یہ کالج کے لڑکے دھوکا دینے کے لئے لڑکیوں سے پریم جتاتے پھرتے ہیں! ان کو سوائے تاک جھانک کے کوئی کام نہیں — یہ سب پریما کی ماں نے انل کے سامنے ہی کہہ ڈالا تھا اور یہ سنکر انل سناٹے میں آگیا تھا۔ پریما جو اس کے پاس کھڑی تھی آہستہ آہستہ سرک کر اپنے کمرہ میں چلی گئی تھی اور انل سوچنے لگا تھا کہ کیا میں نے پریما سے پریم اسی لئے کیا تھا کہ میں اسے دھوکا دوں گا۔ اور کیا مجھے یہ لوگ اتنا ذلیل سمجھتے ہیں کہ میں پریما کو بدنام کرکے اس سے منہ چھپالوں گا۔ وہ یہی سوچتا ہوا دھیرے دھیرے پریما کے گھر سے نکل آیا تھا اور پریما کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا مگر پریما سے محبت نہیں چھوڑی تھی۔ شاید اس کے گھر والوں نے یہ خیال ضرور کیا ہوگا کہ اس کی محبت "کچھ ایسی ہی" تھی اسلئے تو اس نے گھر پر آنا بالکل چھوڑ دیا۔ مگر انل دن رات اسی آگ میں بھنتا رہتا تھا!!

سورج غروب ہوگیا تھا۔ آسمان پر دھندلکا چھانے لگا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف گرد و غبار چھایا ہوا ہے شیل دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کا منہ ذرا سا نکل آیا تھا۔ وہ ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہنسی کے بجائے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے قبرستان سے لوٹا ہو!!

انل راستہ پر کھڑا ہوا کچھ سوچ رہا تھا — لیکن کیا؟ - اسے شیل نہ سمجھ سکا۔ انل اس کے لئے اب ایک معمہ بن گیا تھا۔ شیل سوچکر آیا تھا کہ انل سے وہ کم از کم اتنا ضرور پوچھے گا کہ کیا پریما چلی گئی؟ مگر انل کے ہونٹ ہلے تک نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے پاس ایسے کھڑے تھے جیسے دونوں کے منہ میں زبان ہی نہ ہو!!

انل سوچ رہا تھا کہ پریما اپنے دل میں کہہ رہی ہوگی کہ اس نے اس کو آخری بار بھی نہیں دیکھا! اور شاید اس نے انل سے پریم کرنے میں دھوکا کھایا!!

کچھ دیر بعد شیل بولا: "پریما تو چلی گئی"

انل "ہاں"۔ کہکر خاموش ہوگیا اور سوچنے لگا کہ اس کی واپسی کے متعلق پوچھے یا نہیں۔

شیل نے کہا "وہ جب گئی ہے تو بہت رو رہی تھی اور جب وہ چلنے لگی تھی تو اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ انل کہاں ہے!۔ مگر تم تھے ہی نہیں!! اور جب تم نہ دکھائی دئے تو وہ اور زیادہ رونے لگی"

شیل کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے مگر انل اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہا تھا۔

شیل بولا: "چار پانچ روز کے بعد وہ آجائے گی۔ اور جب وہ آئے تو تم اس سے ضرور ملنا! — اگر تم نے اس سے محبت کرنا

چھوڑ دی ہے تو کیا۔ وہ تو اب بھی کرتی ہے۔" انل نے کوئی جواب نہ دیا اور سوچتا رہا کہ کیا وہ سچ کہتا ہے۔

شیل نے پوچھا: "بتاؤ۔ جب پریا آجاوے گی تو اس سے ملوگے!!"

انل نے کہا: "اچھا جاؤ شیل۔ اب جاؤ۔ ہوسکا تو ضرور ملوں گا!!"

شیل چلا گیا۔ انل وہیں کھڑا رہا۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ درختوں میں سے چاندنی زمین پر چھن چھن کر آرہی تھی۔ اسکا دل چاہ رہا تھا کہ اس چاندنی میں رات بھر ادھر اُدھر گھومے۔ اور وہ ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ اس کے دل میں پریا ہی کا خیال تھا۔ اور اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس کے آنے کے بعد وہ اس سے ضرور ملے گا!!

لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سوچنے لگا کہ جب پریا اس کی نہ ہوسکی تو پھر اس زندگی کے کیا معنی ہیں۔ مردہ دل کو اپنے جسم میں چھپائے پھرنا، کوئی زندگی نہیں، اس لئے اگر وہ اپنے جسم کو بھی چھوڑ دے تو اسے نہ ملنے کا اچھا بہانہ مل جائے گا۔

پریا کے واپس آنے میں دو روز رہ گئے تھے۔ شیل روز آجاتا اور انل کو یاد دلا دیتا۔ اور انل سوچنے لگتا کہ جب وہ پریا کے گھر پر جائے گا تو اس کی ماں کہے گی کہ میں نے دھوکا دیا! اور پریا بھی کہے گی کہ اب میں نے محبت کرنا چھوڑ دیا۔ وہ اسکی ماں کی باتوں کا کیا جواب دے گا وہ پریا کو اپنی محبت کا یقین کیونکر دلائے گا۔ میں پریا کے سامنے اب بھی نہیں جاسکتا، چاہے وہ مجھے دھوکہ باز ہی کیوں نہ خیال کرے۔

پریا کے ایک دن آنے سے پہلے انل کہیں چلا گیا تھا۔ اس کے ملازم کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں گیا کیونکہ وہ اس سے کچھ بھی کہہ کر نہیں گیا تھا۔ شیل دو چار مرتبہ آیا بھی مگر مایوس واپس چلا گیا تھا۔ جب رات بھی گزر گئی اور انل نہ آیا تو شیل کو فکر ہوئی وہ اسکے کمرہ میں آکر میز پر کاغذوں کے ٹکڑے ڈھونڈھنے لگا تھا کہ شاید انل اپنا پتہ کسی کاغذ پر لکھ کر چھوڑ گیا ہو مگر شیل کو کوئی کاغذ ایسا نہ ملا۔

وہ سوچنے لگا "پریا آنے ہی والی ہے، وہ ضرور پوچھے گی کہ انل آئے گا یا نہیں پھر میں کیا جواب دوں گا۔ کہدوں گا کہ وہ یہاں ہے نہیں۔ مگر وہ ملے گا ضرور کیونکہ اس نے وعدہ کر لیا تھا اور شاید کل صبح تک آجائے!!

پریا آگئی لیکن انل نہیں آیا۔ پریا نے انتظار کیا مگر اس کی امید ٹوٹتی گئی۔ وہ اپنے جی میں خیال کر رہی تھی کہ کیا واقعی اسنے پریم کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور ملے گا۔ تو کیا وہ اپنے وعدہ کو بھول گیا۔

ایک دن اخبار پڑھتے ہوئے اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ معلوم ہوتا تھا اس کے جسم میں خون ہی نہیں ہے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ:

"ایک مسافر جس کے سر میں چوٹ لگی تھی اسپتال میں لایا گیا، وہ بالکل بے ہوش تھا۔ اس کے سر میں ٹانکے بھرے گئے۔ جیسے ہی اس کی بے ہوشی دور ہوئی اس کی حالت عجب پاگلوں کی سی ہوگئی۔ اس کو ڈاکٹروں نے بولنے کے لئے منع کر دیا تھا مگر پھر بھی وہ بولے ہی جارہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے وہ پریشان تھا۔ اس نے ایک ڈاکٹر سے کہا "مجھے مرنے سے پہلے گھر پہونچا دو!..." اور وہ اپنے بستر پر سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے سر کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ خون پھر سے جاری ہوگیا وہ کہنے لگا "کیا میں پریا کو نہ دیکھ سکوں گا!!" تھوڑی دیر بعد مرگیا۔ پریا کون ہے اور وہ کون تھا اس کا پتہ اب تک نہیں لگ سکا ہے"

شنکر سروپ بھٹناگر (ایم۔اے)

لکھنؤ کی زبان

(مسلسل)

دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں کس کو ترجیح حاصل ہے

ابتک ہماری بحث کا صرف ایک پہلو تھا اور وہ یہ کہ ہر زبان کو مرکز کی ضرورت ہے، لیکن آج ہم یہ بتائیں گے کہ دہلی، لکھنؤ میں سے کس مرکز کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

آپ کے سامنے یہ اُصول پیش کیا جا چکا ہے کہ زبان کا مرکز ہونا صرف اس امر سے متعلق ہے کہ ایک جگہ اصلاح زبان کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جب تک دہلی کو یہ اہلیت حاصل تھی اُسوقت تک اُس کو مرکزیت کا فخر حاصل تھا اور جب یہ خصوصیت اس کی باقی نہ رہی تو مرکزیت کے شرف سے محروم ہو گئی اور لکھنؤ کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہو گیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

"دہلی میں اگلے دنوں یہ اخلاقی اُصول یقیناً سب جگہ سے بڑھے ہوئے ہوں گے اس لئے کہ وہاں کا دربار سب سے بڑا تھا اور صدیوں سے قایم چلا آتا تھا مگر وہاں تجارت پیشہ اقوام کی سوسائٹی پر غالب آنے کی وجہ سے اگلی ساری تہذیب خاک میں مل گئی ..... جہاں تجارت کو فروغ ہوگا اور تاجروں کی معاشرت خوش باش امیروں اور شریفوں پر غالب آجائے گی وہاں اخلاقی قانون باقی نہیں رہ سکتا چنانچہ اس چیز نے دہلی کے اگلے عظیم الشان درباروں کی ساری آن بان مٹا کے رکھدی اور وہ بات نہیں رہی جو اُس کی ناموری کی تاریخ کے شایان شان تھی۔

دہلی کی تہذیب کو جب تاجروں کا ہجوم تباہ کرنے لگا تو اُس نے اپنے قدیم وطن سے بھاگ کر لکھنؤ کے چھوٹے دربار میں پناہ لی جو اگرچہ چھوٹا تھا مگر اُس کی سواد میں داخل ہونے کے بعد کسی کو نہ نظر آسکتا تھا کہ دنیا میں یہاں سے بڑا کوئی دربار بھی ہے پھر یہاں آزادی سے بیٹھ کے شرفائے دہلی نے اپنے قوانین نشست و برخواست کو برتنا شروع کیا تو چند ہی روز میں یہ حالت ہو گئی کہ اکیلا لکھنؤ ہی سارے ہندوستان میں تہذیب و شایستگی آداب نشست و برخواست کا مرکز تھا اور تمام شہروں کے مہذب لوگ اہل لکھنؤ ہی کی پیروی اور تقلید کر رہے تھے"[1]

سید انشاء اللہ خاں انشا دہلوی کا بیان ہے:

"لکھنؤ بر شہرہائے دیگر شرفے دارد وجان شاہجہاں آباد است زیرا کہ فصحاؤ سلیقہ شعار کہ جان آں شہر باشند۔ دریں شہر مجتمع اند پس شاہجہاں آباد حکم قالب بے جاں دارد ولکھنؤ جان اوست"[2]

---

[1] گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۲۷۸ تا ۲۷۹۔ [2] دریائے لطافت صفحہ ۴۲۔

میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی اپنے رشید شاگرد میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے ارے اب اہل دہلی ..... یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی یا گورے ہیں ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے لکھنؤ کی آبادی میں فرق نہیں آیا ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کی تعریف کئے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اُردو نہ رہا اُردو بازار کہاں ؟ دلی اب شہر نہیں کیمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر"[1]

غالب کے مشہور شاگرد خواجہ الطاف حسین حالی کہتے ہیں :

"دلی جس کو اُردوئے معلیٰ کا مسقط الراس اور جنم بھوم کہنا چاہئے وہاں ناظم و ناثر پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں"[2]

اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی حالت یہ بیان کرتے ہیں :

"لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا وہاں شاعری کا چرچا دلی سے بہت زیادہ سننے میں آتا ہے وہاں ناول ڈراما برابر ملک میں شایع ہوتے رہتے ہیں"[3]

یہ تو بعد کی حالت ہے، جب دہلی کو مرکزیت کا درجہ حاصل تھا اُسوقت کی حالت دہلی کے رہنے والے اور زبان کی ماہیت جاننے والے سید انشا یہ بیان کرتے ہیں :

"فصاحت در دہلی ہم نصیب ہر کس نیست منحصر است در اشخاص معدودہ ہر چہ بامتحاں راقم رسیدہ است ایں است ہیچ محلہ خالی از آدم فصیح نیست در بعضے جائے دو فصیح دو در بعضے جا سہ و در بعضے جا چہار و ہم چنیں شاید کدام محلہ خالی از آدم فصیح نیز باشد لیکن بیشتر چنین است"[4]

دیکھئے انشاء اللہ خاں اپنے ذاتی تجربہ سے کہتے ہیں کہ دہلی میں فصاحت ہر شخص کو نصیب نہیں، اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی یہ حالت بیان کرتے ہیں :

"دریں شہر ہر محلہ محلہ فصیحان است بخلاف شاہجہاں آباد و افکار ایں معنی از دانائی بعید است"[5]

اس میں شک نہیں کہ خاصی و عامی زبان میں فرق ہوتا ہے اسی سبب سے خواص کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے لیکن زبان کی ترقی اس کا نام ہے کہ عوام کی زبان بھی ایک حد تک فصیح و بلیغ ہو جائے۔ یہ شرف دہلی کو کبھی نصیب نہیں ہوا اور لکھنؤ کو یہ منزلت اس وقت حاصل تھی جب اُس کو استقلال کی سند نہیں ملی تھی اور ناسخ کی بدولت تو یہ دولت عام ہو گئی حضرت غالب فرماتے ہیں :

"ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا اس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی زبان ایک ہو گئی"[6]

مرزا رجب علی بیگ سرور کا قول ہے :

جو گفتگو لکھنؤ میں ہے کو بکو سے[7]

---

[1] دریائے لطافت صفحہ ۲۰۔ [2] ادبی خطوط غالب۔ [3] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۸۔ [4] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۸۔ [5] دریائے لطافت صفحہ ۲۲
[6] دریائے لطافت صفحہ ۲۶۔ [7] تذکرۂ جلوۂ خضر صفحہ ۲۳۷۔ [8] فسانۂ عجائب مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۰ء

صفیر بلگرامی کا حسب ذیل بیان سرور کے اس قول کی گویا توضیح ہے :

" لکھنؤ کے عوام و خواص کی زبان یکساں درست ہے اور بندش فقرات کی جاہل و عالم میں یکساں ہے ——— لکھنؤ کے عوام الناس کی زبان شعراء کی ترکیب و بندش سے ملا کے دیکھ لو "[1]

اب صرف لکھنؤ زبان کا مرکز ہے

زبان کو اس نقطۂ کمال پر پہونچا دینے کی وجہ سے اب صرف لکھنؤ زبان کا مرکز ہے ۔ حضرت صفیر بلگرامی تحریر فرماتے ہیں :

" جس قدر مدارج زبان کی درستی کے تھے وہ لکھنؤ میں تمام ہوئے اب جو طریق نکلے گا وہ لکھنؤ کی درست کی ہوئی زبان سے باہر نہ ہوگا "[2]

اس کے مقابلہ میں دہلی کی زبان کی یہ حالت بیان کرتے ہیں :

" وہ صاف شدہ زبان جیسی میر و میرزا نے اختیار کی دہلی میں وہی زبان ابتک مروج معلوم ہوتی ہے اور ولی کی زبان سے کچھ ایسا فرق نہیں معلوم ہوتا چنانچہ مولوی صہبائی دہلوی جو حال میں گزرے ہیں اس کے قایل ہیں اور اپنے رسالہ صرف و نحو اُردو میں لکھتے ہیں اور میں بھی اُس نمونے کے اشعار (ولی دکھنی کی زبان کے) ذوق و مومن تک کے کلام سے دکھا دونگا پھر زبان کیا صاف ہوئی "[3]

یہی شکایت دہلی کی زبان سے مرزا غالب مرحوم کو بھی تھی، چنانچہ انھوں نے اپنے دیوان کے خاتمہ میں اس کا اقرار ان لفظوں میں کیا ہے :

" میرے کلام میں جو الفاظ اور محاورے ناقص بندھ گئے ہیں کیا کروں دلی کی زبان ہی ایسی ہے میں اُنکو ناپسند کرتا ہوں "[4]

دہلی کی اسی زبان کو جو میر و سودا کی تھی لکھنؤ والوں نے درست کیا صفیر بلگرامی لکھتے ہیں :

" ولی کی زبان کو دہلی والوں نے درست کیا اور دہلی والوں کی زبان کو لکھنؤ والوں نے درست کیا اور چونکہ ان تینوں مقاموں کا زمانہ یکے بعد دیگرے ہوا تو لکھنؤ کا زمانہ جو سب کے بعد ہوا اس رو سے اُس کی اصلاح قابل پذیرائی ہوگی "[5]

سید انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی کہتے ہیں :

" فضل زبان و پوشاک و حرکات محبوبان لکھنؤ بر کلام و لباس و ادا ہائے معشوقان دہلی واضح مبرہن است زیرا کہ اہل لکھنؤ خورش و پوشش و زبان و دیگر چیزہا از پدر و مادر خود یاد گرفتہ اند پس دریں چیزہا مثل آنہا باشند و ہر چہ خود از قبیل تراکت صدا حس تکلم و حرکات دلنشین و قطع پوشاک ایجاد نمودہ اند زیادہ از معلومات بزرگان ایشان است مختصر اینکہ اینہا فصیح و بلیغ و لطیف تر از اہل شاہجہاں آباد اند "[6]

رام بابو صاحب سکسینہ تحریر فرماتے ہیں :

" ناسخ کو یہ شرف حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج انھیں کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوئے "[7]

اسی وجہ سے زبان کے رمز شناسوں نے لکھنؤ کو زبان کا مرکز تسلیم کر لیا ہے چودھری نظیر الحسن صاحب فوق کہتے ہیں :

" لکھنؤ کو حسن شناسان سخن نے زبان کا مرکز تسلیم کر لیا ہے "[8]

---

[1] تذکرۂ جلوۂ خضر جلد اول ۔ [2] تذکرۂ جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۲۷۰ ۔ [3] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۲۷۲ ۔ [4] خاتمہ دیوان غالب مطبوعہ مطبع نامون جان آگرہ ۔ [5] جلوۂ خضر ص ۲۷۲ ۔ [6] دریائے لطافت ص ۶۷ ۔ [7] تاریخ ادب اُردو ص ۳۱ ۔ [8] المیزان ص ۶۲

نیر مہدی مجروح کو مرزا غالب کی فہمائش آپ سن چکے ہیں ایک قول اُن کا اور سنئے:

"میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دیکھایا تو لکھنؤ والوں نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا مگر میرے نزدیک تو وہ تراش خراش کی گنجایش ہی نہیں چھوڑ گیا ہاں قواعد نہیں لکھ گیا قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے ہماری دلّی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی"[۱]

دہلی کے مشہور انشا پرداز شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے اس کا متعدد جگہ اعتراف کیا ہے:

"شیخ صاحب (ناسخ) اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دہلی کی قید پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند دیدی اب جو چاہیں کہیں ہم نہیں روک سکتے"[۲]

لکھنؤ والوں کو ٹوکنے کا منھ نہیں کیونکہ جس خاک سے ایسے باکمال اُٹھیں وہاں کی زبان محود سند ہے"[۳]۔

دہلی والوں نے اہلِ لکھنؤ کی تقلید کی

صرف اتنا ہی نہیں کہ لکھنؤ کی زبان کو دہلی والوں نے مستند مانا ہو بلکہ اُس کی تقلید کی نواب مرزا داغ دہلوی نے جنکا بچپن قلعہ معلیٰ میں گزرا اور جن کی زبان خاص قلعۂ معلیٰ کی زبان سمجھی جاتی ہے انھوں نے اہلِ لکھنؤ کی تقلید میں دہلی کی بہت سی لفظیں ترک کر کے لکھنؤ کی لفظیں اختیار کیں، مولانا علی حیدر طباطبائی نے شرح دیوان غالب میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے اور صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:

"دو شخصوں نے اپنے اُستادوں کی زبان کو ترک کیا اور لکھنؤ کی ترکیب و بندش اور طریق کو اختیار کیا ان میں اول اصغر علیخاں نسیم شاگرد مومن، دوم داغ شاگرد ذوق مگر نسیم میں کچھ کچھ بورہ گئی جو اُن کے کلام سے ظاہر ہے اور کیونکر نہ رہتی پہلے طرز کے مشاق ہو چکے تھے مگر حضرت داغ نے انصاف کو کام فرمایا اور ع

متاعِ نیک ہر دوکان کہ باشد

پر عمل کیا اور اپنی زبان بہت حد تک درست کرلی"[۴]

مولانا آزاد دہلوی فرماتے ہیں:

"اب وہ زمانہ آتا ہے (ناسخ و آتش کا) کہ انھیں (اہل لکھنؤ کو) خود صاحب زبانی کا دعویٰ ہوگا اور زیبا ہوگا اور جب دلی کے محاورے میں اختلاف ہوگا تو اپنے محاورہ کی فصاحت پر دلایل قایم کریں گے بلکہ انھیں کے بعض نکتوں کو دلی کے اہلِ انصاف بھی تسلیم کریں گے"[۵]

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"ان لوگوں (ناسخ و آتش) نے اُن کے بعض ہمعصروں نے زبان کے باب میں اکثر قیدیں واجب سمجھیں کہ دلی کے مستند لوگوں نے بھی بعض بعض باتوں کی رعایت اختیار کی"[۶]

حضرت آزاد کو اس کا اعتراف تو کرنا ہی پڑا کہ دہلی والوں نے اہلِ لکھنؤ کی تقلید کی لیکن دہلی زبان سے پروفیسر اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم۔ اے لکچرار الہ آباد یونیورسٹی یوں کہتے ہیں:

"ناسخ و آتش نے وہ کمال حاصل کیا کہ دہلی والوں نے بھی اُن کو اُستاد مان لیا بلکہ اُن کی تقلید کو ایک زمانہ تک فخر سمجھا"[۷]

---

[۱] تذکرۂ جلوۂ خضر صفحہ ۲۳۶ - [۲] آب حیات صفحہ ۲۷۱ - [۳] آب حیات صفحہ ۳۷۲ - [۴] تذکرۂ جلوۂ خضر صفحہ ۲۶۹ - [۵] آب حیات صفحہ ۳۴۰ - [۶] آبحیات صفحہ ۳۷۲ - [۷] مختصر تاریخ ادب اردو

ان پر زور لفظوں کی تائید غالب کے اس قول سے ہوتی ہے:

"میاں جب ناسخ کا کلام دلی میں پہونچا جیسا تم نے دلی کے دیوان کا حال سُنا ہوگا کہ دلی میں آیا تو جیسے کسی چیز پر لوٹ پڑتے ہیں اسی طرح اُس کے کلام پر گر پڑے ——— مگر وہ زبان نظم کر دینا تھا اس میں کچھ دقت نہ ہوئی ———
مگر ناسخ کے کلام نے جس کو علم درکار تھا اور قاعدے کے پرتو پر ڈالا گیا تھا دلی میں آکر سب کو حیران کر دیا اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا یہاں تک کہ شعراء نے اس کو رغبت کی نگاہ سے دیکھا ———
یاد رہے کہ زبان لکھنؤ کی مستند ہے"[1]

غالب کے اس قول کو حضرت اثر عظیم آبادی نے ان لفظوں میں نقل کیا ہے:

اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت (غالب) فرماتے تھے کہ میری غزل گوئی کی ابتدا تھی ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے پہل پہونچا شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی میں نے اور مومن نے ان کا تتبع ہونا چاہا"[2]

یہ غالب کا قول ہے جو ہمیشہ شاہراہ عام سے کٹ کے اپنے لئے دوسرا راستہ نکالتے تھے اور کسی کی تقلید ننگ سمجھتے تھے — لوگ غلطی سے ناسخ کی اصلاحوں کو چند لفظوں کے ترک و اختیار یا تذکیر و تانیث کی تعلیم تک محدود سمجھتے ہیں، حالانکہ اُن کا اصلی فخر زبان کو با اُصول بنانا ہے۔ انسے پہلے اُردو کوئی با اُصول زبان نہ تھی اور انداز بیان اور صرف و نحو میں زیادہ تر فارسی کی تابع تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کلام میں تعقید اور گنجلک پائی جاتی تھی اور ناسخ نے اسی نقص کو دور کیا۔ مثالاً ہم میر امن کی باغ و بہار سے چند فقرے نقل کرتے ہیں اور اسی کے مقابل میں لکھنؤ کی درست کی ہوئی زبان بھی پیش کرتے ہیں:

دہلی کی زبان	لکھنؤ کی زبان
ایسی ایسی تباہی کھا کے ویسے شہر سے کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نار میں گڑا ہے جلاوطن ہوا۔	ایسی ایسی تباہی اُٹھا کے اس شہر سے جلاوطن ہوا جو میرا جنم بھوم ہے اور جہاں آنول نال گڑی ہے۔
منشی میر بہادر علی جی کے وسیلہ سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔	منشی میر بہادر علی صاحب کے وسیلہ سے جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے حضور تک رسائی ہوئی۔
اے عزیزاں میں بادشاہ زادہ جگر سوز اس قلیم نیمروز کا ہوں۔ حوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھو۔	اے عزیزاں میں اس اقلیم نیمروز کا جگر سوز شہزادہ ہوں۔ فرمایا کہ شہزادوں کے ستاروں کا حال دیکھو۔
بلکہ ایک اُستاد دانا کار آزمودہ واسطے میری تربیت کے معین کیا۔	بلکہ ایک دانا اور کار آزمودہ اُستاد میری تربیت کے واسطے معین کیا۔

فارسی میں مضاف کے بعد مضاف الیہ آتا ہے جیسے "اسپ من" "وطن ما" بالکل اسی قاعدے پر میر امن لکھتے ہیں:

"وطن اور جنم بھوم میرا ہے"

ناسخ کے نزدیک یہ ترکیب فصیح نہ تھی، اس لئے انھوں نے اس کو اُلٹ دیا یعنی "میرا وطن اور جنم بھوم" صحیح قرار دیا، اس سے معلوم ہوا کہ خود اُردو کا کوئی انداز بیان نہ تھا بلکہ وہ فارسی کی اُنگلی پکڑ کے راستہ چلتی تھی ممکن ہے اس کا جواب یہ دیا جائے کہ

---

[1] تذکرۂ جلوۂ خضر جلد اول صـ۳۳۶ — [2] کاشف الحقائق صـ۱۲۴

نیر مہدی مجروح کو مرزا غالب کے [illegible] کا ترجمہ کیا ہے اس لئے اس کی سند نہیں اس کا جواب ہمارے پاس یہ موجود ہے کہ ترجمہ کے لئے یہ ضروری "میاں آزاد" سکندالیہ کی ترتیب میں بھی اصل کی متابعت کی جائے چنانچہ اس کتاب میں بھی لفظی ترجمہ کی پابندی نہیں کی گئی اور اسکا ت ایک تو یہی ہے کہ قصہ کا نام تک بدل گیا ہے یعنی بجائے چہار درویش کے باغ و بہار رکھا گیا ہے جس کو اصل نام سے کوئی مناسبت نہیں، میر امن خود لکھتے ہیں:

"جان گلکرسٹ صاحب بہادر نے ——— لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو، مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے خاص و عام بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو موافق حکم حضور کے میں نے بھی اُسی محاورے میں لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"

اس کے علاوہ ہم نے ایسے فقرے بھی لکھدئے ہیں جو خاص میر امن کے ہیں اور اصل قصہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اس پر بھی اگر کسی کو اصرار ہو تو غالب کی یہ عبارت دیکھے:۔

خر اور خرشید یہ دونوں اسم آفتاب کے ٹھیرے جب عرب و عجم مل گئے تو اکابر عرب نے کہ وہ منبع علوم ہوئے واسطے رفع التباس خر میں واو معدولہ بڑھا کر خور لکھنا شروع کیا ہر آئینہ متاخرین نے اس قاعدے کو پسند کیا۔ (ادبی خطوط غالب ص۹۵

غالب ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "جو آپ پر معلوم ہو وہ مجھ پر مجہول نہ رہے"

یہ بالکل فارسی کا ترجمہ ہے یعنی "انچہ بر شما ظاہر است بر ما مجہول نماند"

اس سے ثابت ہے کہ اُسوقت خود اُردو کا کوئی مستقل انداز بیان نہ تھا اور سب سے پہلے ناسخ نے اس طرف توجہ کی اور غالب بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ زبان کو اگر زبان کر دکھایا تو لکھنؤ والوں نے"۔ اُن کی یہ عبارت آپ پہلے سُن چکے ہیں حضرت اثر عظیم آبادی بھی غالب کے موئید ہیں:

"ناسخ نے اُردو کو اپنے کلام معجز نظام سے ایک شستہ اور پاکیزہ زبان بنا ڈالا"[1]

انصاف یہ ہے کہ ناسخ کی شخصیت اس لحاظ سے بالکل منفرد نظر آتی ہے۔ مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

"اسی دور نے ترقی کر کے متوسطین کے زمانہ میں شیخ ناسخ جیسا مصلح زبان و مجدد فن پیدا کیا جنھوں نے الفاظ کی تنقیح و تہذیب نہایت مکمل طور پر کر دی اور اُن کے بعد شعراء اسی زبان کی پیروی کرتے ہیں"[2]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

شیخ ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شائستہ بنا دیا اور آج تمام شعراء اُسی زبان کے مقلد ہیں"[3]

صفیر بلگرامی کہتے ہیں:

اور میں کیا جتنے انصاف پسند اور صاحبانِ ادراک ہیں سب جانتے ہیں کہ اسوقت کی زبان اُردو جو تمام ہندوستان میں شعراء و فصحا کے برتاؤ میں ہے لکھنؤ کی درست کی ہوئی ہے، اس پر قواعد و ضوابط کی کتابیں درست ہوئی ہیں"[4]

جب زبان با اُصول بن چکی اور وہ اُصول مقبول ہو چکے تو اب جو قلم اُٹھائے گا وہ بے ارادہ لکھنؤ کا مقلد بن جائے گا۔ چنانچہ عہد ناسخ کے بعد

---

[1] کاشف الحقائق ص۸۸ — [2] شعر الہند ص۱۵ — [3] شعر الہند ص۱۵ — [4] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول

ملک کے نثاروں میں ایک بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جس نے ناسخ کے مقرر کئے ہوئے قاعدے کی خلاف ورزی کی ہو اور ناسخ سے پہلے کی دہلوی زبان کی تقلید کی ہو، اس طرح سارے ملک پر لکھنؤ کی زبان چھا گئی اب جو تغیر ہوگا وہ جزوی ہوگا اسی بنا پر صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:

"اب جو تغیر ہوگا وہ لکھنؤ کی درست کی ہوئی زبان سے باہر نہ ہوگا"

اتنا سب جانتے ہیں کہ اُردو شاعری کے ابوالاباء ولی دکھنی ہیں۔ دہلی مدت سے سلاطین تیموریہ کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے اہل کمال کا مرکز تھی، ولی بھی چلتے پھرتے آنکلے اور فارسی کے سانچہ میں اُردو کے ڈھلے ہوئے سکے پیش کئے۔ اسوقت یہاں فارسی شعرا میں مرزا معز موسوی خاں فطرت، مرزا عبدالغنی قبول، مرزا عبدالقادر بیدل، قزلباش خاں امید، سلیمان قلی خاں داؤد، علی قلی خاں ندیم، سراج الدین علی خاں آرزو، میر شمس الدین فقیر، شیخ سعداللہ گلشن، ایسے صاحبان فضل و کمال کا مجمع تھا، اس جدید چیز میں کچھ ایسی لذت تھی کہ سب کے سب اس کی طرف جھک پڑے اور تفننًا اس میں بھی کہنا شروع کیا۔

ملا عبدالواسع ہانسوی ایک کتاب لغات اُردو کی مرتب کر چکے تھے اور اس کا نام انھوں نے غرائب اللغات رکھا تھا۔ اب اُردو کی تدوین کا خیال پیدا ہوا تو سراج الدین علی خاں آرزو نے اس غرائب اللغات پر نظر ثانی کر کے بہت سے الفاظ اضافہ کئے غلطیوں کو صحیح کیا اور نوادر الالفاظ نام رکھا جب اور لوگوں کو بھی اس زبان میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا تو لازمًا انھیں ارباب فضل و کمال کے دامن کے سایہ میں اپنے ذوق شعری کو پروان چڑھایا ان صاحبان کمال میں خان آرزو نے سب سے زیادہ توجہ کی اس لئے وہی سب کا مرجع بن گئے اور سب اُن کے قلم کے سایہ کے نیچے جمع ہو گئے انھیں سے رموز سخن دانی سیکھے عروض و قافیہ کے باریک راستے معلوم کئے زبان کے حدود اور قاعدے سمجھے کلام پر اصلاح بھی لی چنانچہ بیشتر اہل معنی انھیں کے خوان ذوق کے ریزہ چیں تھے اگرچہ سن میں بڑے تھے، جیسے شاہ مبارک آبرو بقول حضرت آزاد:

"باوجودیکہ بڈھے شاعر اور پرانے مشاق تھے مگر خان آرزو کو اپنا کلام دکھا لیتے تھے"

دوسرے شیخ شرف الدین مضمون ہیں جن کے بارے میں حضرت آزاد لکھتے ہیں:

"باوجودیکہ مضمون سن رسیدہ تھے اور خان آرزو سے سن میں بڑے تھے مگر انھیں غزل دکھاتے تھے اور اصلاح لیتے تھے"[۲]

ان وجوہ سے خان آرزو کو دور متقدمین کی صف اول میں جگہ ملنا چاہئے

حضرت آزاد کہتے ہیں:

خان آرزو کو اُردو پر وہی دعویٰ پہونچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ اور منطق پر ہے جب تک کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اُردو خان آرزو کے عیال کہلائیں گے"[۳]

سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی تحریر فرماتے ہیں:

"اسوقت کے جتنے شعراء تھے سب ان کو اپنی غزل دکھاتے تھے"[۴]

---

[۱] آب حیات ص۹۷ - [۲] آب حیات ص۱۰۱ - [۳] آب حیات ص۱۲۱ - [۴] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول

اس زمانہ (دور اول) کے شعراء یہ ہیں:

شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، شاہ حاتم، محمد شاکر ناجی، مصطفےٰ خاں یکرنگ - اگرچہ ان لوگوں کی شاعری کوئی درجۂ اعتبار نہیں رکھتی۔ لیکن ان کا ذکر محض سلسلۂ تاریخ کی کڑیاں جوڑنے کے لئے کر لیا جاتا ہے۔ اس دور کے شعراء نے اصلاحِ زبان کی طرف کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ یہ وہ شعراء تھے جن سے دہلی میں شاعری کی صبح ہوئی اسوقت اورنگ زیبی عہد کی شام ہو چکی تھی جس کی رات اتنی طولانی تھی کہ گیارہ سال چودہ روز گزر گئے اور ہیبتناک اتنی کہ نو بادشاہوں کے جنازے گئے اسکے بعد اگرچہ محمد شاہی اقبال کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب سے نکلا مگر ابھی کچھ ہی بلند ہوا تھا کہ نادر شاہ درانی گھٹا کی طرح ساری دلی پر چھا گیا اور تین روز تک تلواروں کی بجلیوں میں سروں کی بارش ہوتی رہی۔

آپ نے دیکھا کہ شاعری کے آغاز ہی سے دلی کے اطمینان کا خاتمہ ہو گیا۔ شاعری تو ہمیشہ بزم کو ڈھونڈھتی ہے، دہلی کی بزم گاہ رزم گاہ بن چکی تھی لہذا شاعری نے بھی کھسکنا شروع کیا۔

سعادت خاں برہان الملک کو اودھ کا صوبہ مل چکا تھا اور وہ شرفاء و سرداران فوج جو اُردو کے مالک تھے اودھ کی طرف آنا شروع ہو گئے تھے۔

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ (بہادر شاہ اول) اُن کے بعد عالمگیر ثانی کا زمانہ آیا یہ دونوں عہد بارہ سال میں ختم ہو گئے، اس مدت میں احمد شاہ ابدالی نے دو دفعہ دہلی کو تہ و بالا کیا سلطنت کی یہ کمزوری دیکھ کے مرہٹوں کا طوفان اس زور سے آیا کہ مغل اعظم کی عظمت کا چراغ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا وہ قلعہ معلی جس کی طرف نگاہ کرنے میں رستم و اسفندیار کے کلیجے کانپتے تھے مرہٹوں کی جولانگاہ بن گیا اور وہ دیوان عام جس میں قدم رکھنے والا نقیب کے باادب نگاہ روبرو کہتے ہی لرزہ براندام ہو جاتا تھا اُس دیوان عام کی وہ سقف طلائی جس کے نیچے آلِ تیمور کی عظمت کا آفتاب چمکتا تھا مرہٹوں کی دست درازیوں کی نذر ہو گئی۔

شاہ عالم نے سلطنت کی کمزوری، مرہٹوں کی سرشوری، سکھوں کی سینہ زوری، اور نمک خواروں کی کورنگی سے بے بس ہو کر انگریزوں کے دامن میں پناہ لی اور سلطنت دیکر پندرہ لاکھ کے گزارہ پر قناعت کر کے گوشہ نشین ہو گئے اس زمانہ کی حالت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دہلی پر وہاں کی زمین تنگ ہو گئی تھی۔ سودا کا شہر آشوب اور قصیدہ تضحیک روزگار پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیمی امیرزادے نان شبینہ کو محتاج ہو گئے تھے۔ انشاء اللہ خاں لکھتے ہیں:

"شاہجہاں آبادیاں در شہر خود بیشتر محتاج بنان شبینہ و کمتر نان میخورند"

مثل مشہور ہو گئی تھی:

"شاہ عالم ثانی نہ چولھے پہ توا نہ گھڑے میں پانی"

اس عالم میں متوسطین کا دور شروع ہوا جس مملکت میں پشتینی رئیس زادے فاقہ کر رہے ہوں وہاں شاعروں کا کہاں ٹھکانا لگ سکتا ہے سب کے دل اچاٹ ہو گئے لیکن اب جائیں تو کہاں؟

اودھ کا دربار حقیقت میں دہلی ہی کا دربار تھا اور اسی راہ کا سالک معاشرت میں وہی تکلف و نفاست اہلِ علم کی وہی سرپرستی شعراء کی وہی قدردانی نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی برباد ہو گئی اور لکھنؤ آباد ہو گیا۔ رام بابو صاحب سکسینہ لکھتے ہیں:

"اس عام بدامنی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کے بھاگنے لگے وہ شاعر جو دامنِ دولت سے وابستہ تھے مثلاً میر،

سودا، میر حسن، انشا وغیرہ انھوں نے بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا جوان کا اس وقت قدر شناس اور اُن کے واسطے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی قدر دانی میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا شعرائے دہلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے سلطنت کی طرف سے اُنکے واسطے جاگیریں، وظائف، انعام واکرام مرحمت ہوئے اور اُن کی نازک مزاجیاں اور بد دماغیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں بلکہ اکثر انھیں صفات کی تعریف کی جاتی تھی، سلسلۂ روابط کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے نوابان عہد اور امرائے وقت نے اکثر شعراء کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا اور ان کو اپنا رفیق و مصاحب بنا لیا"[1]

حقیقت میں لکھنؤ کا دربار دہلی کے دربار کی تصویر تھا فرق یہ تھا کہ دہلی کی تصویر کا رنگ اُڑ چکا تھا اور لکھنؤ کی تصویر میں ہلا کی رنگینی تھی اس لئے دہلی کا رہا سہا رنگ بھی اُڑ گیا زمانہ کے مصور نے وہ رنگ پریدہ بھی لکھنؤ کی تصویر میں بھر دیا یعنی تمام اہلِ کمال خواہ وہ کسی فن کے ہوں دہلی چھوڑ کے لکھنؤ چلے آئے۔ میر انشا اللہ خاں، انشا سوقت کی حالت یہ بیان کرتے ہیں:

"کثرت دہلویان فصیح دریں شہر بدرجہ است کہ حصر امکان ندارد"[2]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"سپاہی و مصاحب پیشہ ولطیفہ گو و بذلہ سنج و مطرب و قصہ خواں دریں شہر ہمہ از دہلی آمدہ اند"[3]

ایک اور جگہ یوں تحریر فرماتے ہیں:

"در لکھنؤ از سبب قرب تمام شاہجہاں آبادیاں فصیح و غیر فصیح جمع شدہ اند دامن شہر شاہجہاں آباد شدہ است لکھنؤ نمانده است"[4]

انشاؔ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی جس کے کوچے اوراق مصور تھے صفحۂ سادہ بن گئی ہر طرح کے اہلِ کمال اُس کے سواد سے نکل کے لکھنؤ چلے آئے اور لکھنؤ شاہجہاں آباد بن گیا۔ یہاں صرف اُن شعراء کے نام لکھے جاتے ہیں جو دہلی چھوڑ کے لکھنؤ چلے آئے۔

(۱) مرزا محمد رفیع سوداؔ (۲) میر محمد تقی میرؔ (۳) میر محمد سوزؔ (۴) مرزا جعفر علی حسرتؔ (۵) میر حیدر علی حیرانؔ (۶) قیام الدین قائمؔ (۷) اشرف علی خاں فغاںؔ (۸) خواجہ حسن حسنؔ (۹) مرزا فاخر مکیںؔ (۱۰) میر ضاحکؔ (۱۱) بقاء اللہ خاں بقاؔ (۱۲) میر حسن حسنؔ (۱۳) میر قمر الدین منتؔ (۱۴) میر ضیاء الدین ضیاؔ (۱۵) شیخ قلندر بخش جرأتؔ (۱۶) میر انشاء اللہ خاں انشاؔ (۱۷) شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ۔ (۱۸) سعادت یار خاں رنگینؔ (۱۹) مرزا محمد حسن قتیلؔ۔

یہاں چند باتیں ذہن نشین کر کے آگے بڑھنا چاہئے:

(۱) دہلی سے لکھنؤ آنے کا خیال اُسی کو ہوتا تھا جس کا کمال دہلی میں مسلم ہو چکا تھا۔ یہ لوگ ایسے ہی صاحبان فضل و کمال تھے جن کا کلام لوگ دہلی سے تحفتہً لے جاتے تھے۔

(۲) اس زمانہ میں دہلی شعراء سے خالی ہو گئی لکھنؤ سے آیا ہوا کلام گرمی محفل کا سبب بن تا تھا، اس طرح لکھنؤ سے دہلی متاثر ہو رہی تھی۔

(۳) اس دور (متوسطین) کے شعراء وہ تھے جنھوں نے اصلاح زبان میں پہلا قدم اُٹھایا اور وہ سب دہلی چھوڑ کے لکھنؤ آ چکے

---

[1] تاریخ ادب اردو ص۲۵۸ - [2] دریائے لطافت ص۳۶ - [3] دریائے لطافت ص۹۰ - [4] دریائے لطافت ص۱۱

تھے لہذا دہلی کی زبان میں جو کچھ ترقی و اصلاح ہوئی وہ لکھنؤ میں ہوئی اور اُن کو قبول کرنے میں دہلی والوں کو تامل نہ ہوا کیونکہ ایک تو اصلاح کرنے والے دہلوی تھے دوسرے اُن کے کمال کا سکّہ دلوں پر بیٹھ چکا تھا اسوجہ سے دہلی والوں سے ایک طرف تو اصلاح زبان کا مادہ سلب ہوتا رہا، دوسری طرف وہ اس کے عادی ہوتے گئے کہ لکھنؤ میں جو اصلاحیں ہوں اُن کو قبول کرکے اپنی زبان درست کریں اس طرح وہ لکھنؤ کی تقلید کے عادی ہوتے گئے۔

(۴) اصلاح زبان کی قوت لکھنؤ میں نشوونما پا رہی تھی اور اہلِ لکھنؤ میں یہ استعداد پرورش پا رہی تھی جب زمانے نے دہلی والوں کی جگہ خالی کی تو لکھنؤ والے اُن کی جگہ پر آگئے اور زبان کے مالک بن گئے یہ دور دلی کے بھی سنبھالے کا زمانہ تھا یعنی اس زمانہ کے شعراء دہلی میں رہے لیکن چونکہ ان شعراء نے ایسی فضا میں آنکھ کھولی تھی جس پر لکھنؤ کی تقلید چھائی ہوئی تھی اور یہ بات دلی والوں کی جبلت بن گئی اس لئے ان شعراء نے آنکھ بند کرکے بے ارادہ لکھنؤ کی تقلید کی۔ مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی کہتے ہیں:

"جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہونچا جیسا تم نے دلی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ جس طرح لوگ نئی چیز پر گرتے ہیں اسی طرح اُسکے کلام پر گر پڑے ——— مگر ناسخ کے کلام نے دہلی میں آکر سب کو حیران کر دیا اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا یہاں تک کہ شعراء نے اِدھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا"[1]

ان وجوہ سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان تقریباً ایک ہوگئی اسی بنا پر دہلی کے مشہور انشاپرداز حضرت آزاد لکھتے ہیں:

"اب جو زبان دہلی میں بولی جاتی ہے وہ گویا انھیں (اہلِ لکھنؤ) کی ہے"[2]

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی لکھتے ہیں:

"جو لوگ دہلی کے فصحا و نقاد و مالک زبان و قلم ہیں ان کا کلام لکھنؤ کی زبان سے مطابقت رکھتا ہے کس وجہ سے کہ جب سے میر و سودا لکھنؤ میں آکے رہ پڑے اُسی زمانہ سے دلی گوش بر آواز لکھنؤ ہوگئی پھر انشاءاللہ خاں اور جرأت کے کلام نے اُن کی توجہ کو ادھر سے پھرنے نہ دیا اُن کے بعد ناسخ و آتش کے مشاعروں نے متوجہ کر لیا اخیر میں میر صاحب کے مرثیوں نے خاص و عام سب کی زبان پر اثر ڈالدیا اس زمانہ میں نواب مرزا شوق کی تینوں مثنویاں گھر گھر پڑھی جانے لگیں کہ لوگوں کو حفظ ہوگئیں، پھر امانت انھیں دنوں میں اندر سبھا کہہ کے اُردو میں ڈرامے کے موجد ہوئے اس کے علاوہ نامہ قلق و اسوخت امانت اور شہروں کی طرح دلی کی گلیوں میں لوگ گاتے ہوئے پھرنے لگے زبان کی شہرت کے اسباب پر جب غور کیجئے تو یہی لوگ معلوم ہوتے ہیں جن کے نام گزرے اور ان کے کلام کی شہرت نے اس زبان کو اس قدر مانوس کر دیا یہاں تک کہ دلی اور لکھنؤ کی زبان تقریباً ایک ہوگئی اس پر آزاد سلمہ اللہ کی شہادت کافی ہے"[3]

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں کہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان تقریباً ایک ہوگئی حضرت آزاد بھی گویا کی لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ بالکل ایک نہیں ہوئی کچھ فرق رہ گیا، یہی فرق دونوں جگہ کی زبان میں حد فاصل اور صورت امتیاز پیدا کر سکتا ہے اور اسی سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ یہ فرق اس وقت صاف نظر آجائے گا جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ دلی والوں نے لکھنؤ والوں کی تقلید کس حد تک کی، گزشتہ مضمون میں اس پر پوری بحث کی جا چکی ہے کہ دہلی والوں نے ترتیب نحوی میں پوری پوری

---

[1] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۲۳۶ - [2] شرح دیوان غالب مصنفہ طباطبائی صفحہ ۲۷۰ تا ۲۷۲ - [3] آب حیات صفحہ ۳۴۰۔

تقلید کی۔ پھر بھی زبان جیسی صاف ہونا چاہئے تھی ویسی نہ ہوئی اس کی دو وجہیں ہیں ایک وجہ غالب کی زبانی سنئے:

"ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی زبان ایک ہوگئی وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہونچتے ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھ ہوا وہ کیا مگر یاد رہے کہ - زبان لکھنؤ کی مستند ہے"

دوسری وجہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں ناسخ نے تقریری زبان کو اتنا درست کیا کہ تمام ناتراشیدہ لفظیں اور ترکیبیں دور ہوکے زبان ادبی بن گئی دہلی میں تقریری زبان اتنی ترقی نہ کرسکی کچھ بھونڈی لفظیں، بھدی ترکیبیں باقی رہ گئیں - صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:

"اگرچہ یہ بات مانی گئی ہے کہ ہر مقام کی زبان تقریری اور تحریری علٰحدہ علٰحدہ ہوتی ہے مگر ناسخ نے جب اُردو زبان کی اصلاح کی تو کلیہ یہ قایم کیا کہ زبان تقریری کو ایسا درست کردو تحریر میں بھی ویسا ہی لکھو یعنی تقریر و تحریر میں کچھ فرق نہ ہو اس کا فائدہ یہ ہے کہ زبان کی درستی کا خیال رہے گا اور محاورات صحیح یاد رہیں گے اور سب کی سمجھ میں مطلب یکساں آئیں گے چنانچہ لکھنؤ کے عوام و خواص کی زبان یکساں ہے اور بندش فقرات کی جاہل و عالم میں یکساں ہے ——— لکھنؤ کے عوام الناس کی زبان شعراء کی ترکیب و بندش سے ملا کے دیکھ لو ——— بخلاف دہلی کے کہ تقریر و تحریر عوام و خواص کا فرق تو جیسا ہے ویسا ہے شعراء کا اختلاف ایسا نظر آیا کہ قواعد اور محاورات جو کتابوں میں لکھتے ہیں وہ بہت صحیح اور درست لکھتے ہیں اور شعر میں اُن قواعد کو مستعمل نہیں کرتے"[1]

میرا خیال ہے کہ ہر جگہ کے لوگوں نے ادبی زبان میں لکھنؤ کی پوری تقلید کی اس لئے وہ درست ہوگئی اور اس میں یکسانیت پیدا ہوگئی اور تقریری زبان میں ہر جگہ کے لوگوں نے نحوی ترتیب کو تو بالکل لکھنؤ کی زبان کے مطابق کرلیا لیکن بہت سے ناتراشیدہ الفاظ وہاں کی تقریری زبان میں رہ گئے - حضرت انشاء فرماتے ہیں:

"ہر شہر را زبانے است مخصوص زبان شہر ہر کس در آنجا متولد می شود و بزبان شہر حرف می زند"[2]

انشاء اللہ خاں اہل زبان بننے کے لئے چار شرطیں ضروری قرار دیتے ہیں:

"(۱) ماں باپ اہلِ زبان ہوں - (۲) اہلِ زبان کی صحبت میں رہے - (۳) تحصیل و تحقیق زبان میں ہر وقت مشغول رہے - (۴) طبع نقاد اور ذہن وقاد رکھتا ہو"[3]

ان چار شرطوں میں سے اگر پہلی شرط فوت ہوجائے مگر طلب صادق ہو تو کامیابی ممکن ہے لیکن باقی شرطیں بالکل ضروری ہیں اسی بنا پر نواب امداد امام اثر کہتے ہیں:

"ہم لوگوں کا بڑا کمال یہی ہے کہ زبانداں کہلائیں اہلِ زبان ہونا تو تمامتر خارج از امکان ہے"[4]

بعض حضرات لکھنؤ کی زبان پر فارسیت کے غلبہ کا الزام رکھ کے اُس کو ٹکسال باہر قرار دیتے ہیں - ان کا اعتراض یہ ہے کہ زبان کو جتنی صفائی کی ضرورت تھی وہ میر و میرزا کے زمانہ میں حاصل ہوگئی اس کے بعد لکھنؤ میں جو اصلاح ہوئی اُس سے زبان کی اصلی لطافت جاتی رہی کیونکہ اس میں فارسی کا غلبہ ہوگیا، اگر غور کیا جائے تو یہ اعتراض اصول و تاریخ کسی حیثیت سے کوئی وزن نہیں رکھتا - اُصولی حیثیت سے یوں کہ زبان کو کسی منزل پر تعمیر و اصلاح سے روک دینا اُس کی زندگی ختم کردینا ہے

---

[1] تذکرہ بلوۂ خضر صفحہ ۲۷ - [2] دریائے لطافت صفحہ - [3] دریائے لطافت - [4] کاشف الحقایق

علاوہ اس کے لکھنؤ کی زبان میں فارسیت کا عنصر غالب بتانا بھی حقیقت پر مبنی نہیں اُردو نثر کی وہ کتابیں جو لکھنؤ اور دہلی میں ایک ہی زمانہ میں لکھی گئی ہیں اُن کا مقابلہ میرے بیان کی تائید کرے گا اور اگر نظم کے سرمایہ کو بھی لے لیا جائے تو فارسیت کے غلبہ میں دہلی کا پلّہ بھاری ہو جائے گا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ لکھنؤ ایک مدت سے مسلمانوں کا علمی مرکز ہے اس وجہ سے وہاں ایسے لوگوں کی کافی تعداد موجود رہتی ہے جو عربی و فارسی کی تحصیل میں کافی وقت صرف کرتے ہیں اور اس لئے انکی زبان پر عربی لفظوں کا چڑھ جانا فطری امر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ کی ٹکسالی اُردو میں عربی فارسی کی لفظیں اُسی نسبت سے ملیں گی جس نسبت سے وہ دہلی کی اُردو میں پائی جاتی ہیں اور لکھنؤ میں بھی وہی لوگ اُردو کے ماہر سمجھے جاتے ہیں جن کو ہندی لفظوں اور محاوروں کے استعمال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے، لکھنؤ کی زبان سے ہمارا مقصود یہی چیز ہے اور اسی کی تقلید ضروری بتائی جا رہی ہے درد عربی فارسی لفظوں کے استعمال میں جو درجہ اہلِ لکھنؤ کو حاصل ہے وہ اور شہروں کے افراد کو بھی حاصل ہے ہم ہرگز اس کے حامی نہیں ہیں کہ عربی فارسی لفظوں کے استعمال میں اہل لکھنؤ کی تقلید کی جائے اگر اہلِ لکھنؤ عربی فارسی لفظیں زیادہ استعمال کرتے ہیں تو بُرا کرتے ہیں اور اس معاملہ میں وہ ہرگز لائق تقلید نہیں بلکہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ لکھنؤ والوں نے جو کچھ زبان کو ترقی دی وہ ہندی لفظوں کے استعمال کے ذریعہ سے، اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

سید محمد باقر شمس

شہرِ خموشاں

سنہ ۱۹۴۱ء کی تازہ اور بالکل انوکھی تصنیف

جناب سید محمود صاحب مورخ بی۔ اے مدیر روزنامہ مسلمان دہلی کے ہولناک اور لرزہ خیز افسانوں کا مجموعہ "شہرِ خموشاں" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ اس کا مقدمہ جناب شاہد احمد صاحب مدیر مجلہ ساقی دہلی نے لکھا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اُردو میں اس طرز کے افسانے پہلے کبھی شایع نہیں ہوئے ہیں۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت صرف ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

نیاز فتحپوری۔ اُردو کے بہترین نقاد اور افسانہ نویس مولانا نیاز فتحپوری کی داستان حیات اور ان کی افسانہ نویسی پر مفصل تبصرہ اُردو کے دوسرے مشہور نقاد جناب سید محمود صاحب مورخ بی۔ اے کے قلم سے۔ یہ ایک بیحد دلچسپ اور قابلِ مطالعہ تصنیف ہے۔ جو لوگ بطور ایک افسانہ نویس کے کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ قیمت صرف ۱۲ر علاوہ محصول ڈاک۔

گلفروش پبلشنگ ہاؤس۔ لال دروازہ دہلی

تاریخ اودھ کا ایک ورق

بادشاہ بیگم

(مسلسل)

تیسرا باب

(رفیع الدین حیدر محمد مہدی فریدوں بخت معروف بہ مناجان کی پیدائش کا حال اور اُنکی ولدیت کے متعلق تحقیق)

نصیر الدین حیدر کی خواص، سکھ چین (افضل محل) کے بطن سے ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۵ھ (۱۴ ستمبر ۱۸۲۰ء) کو وضع حمل کے مقررہ وقت کے بیس مہینے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کو مامُوں اور اصیلوں نے غروب آفتاب سے ۴ گھنٹہ قبل غسل دیکر بادشاہ بیگم کی گود میں دیا۔ بادشاہ بیگم کو بے حد خوشی ہوئی اور اس نومولود کا نام محمد مہدی رفیع الدین حیدر رکھا گیا اور مناجان عرفیت قرار پائی بادشاہ بیگم نے، محسن الدولہ کے ذریعہ سے طلائی نہریں شاہی نذر کے لئے بھیجیں اور سلیمان جاہ کو بھی خود نذر پیش کرنے کے لئے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ لیکن راجہ امرت لال عرض بیگی، (ظفر الدولہ منتظم الملک کپتان) فتح علی خاں (بہادر ہیبت جنگ) اور شیدی عبدالکریم داروغہ دیوان خانہ نے کہا کہ شاہی حکم ہے کہ آپ لوگ دربار میں نہ جائیں دوسرے دن امرت لال کی اطلاع پر بادشاہ نے پھاٹک کے تمام سپاہیوں کو برطرف کر دیا اور اُن کی جگہ فوجی پہرہ بٹھلا دیا گیا۔

دو دن کے بعد وقایع نگاروں نے جان مکناٹن رزیڈنٹ کو ان واقعات سے مطلع کیا، یہ بادشاہ کی ملاقات کے لئے گئے اور شکایت کی کہ آپ نے اپنے پوتے کی پیدائش کی مجھکو مطلق اطلاع نہ دی۔ یہ سنکر بادشاہ کے چہرہ پر استعجاب کی کیفیت ظاہر ہوئی، اس پر رزیڈنٹ نے دوبارہ شکایت کی اور نومولود کی پیدائش کے متعلق جو کچھ سنا تھا اُس کا بھی اعادہ کیا بادشاہ یہ سنکر متفکر ہو گئے اور کہا کہ وقت مناسب نہیں ہے پھر کبھی اس مسئلہ پر گفتگو ہوگی۔ رزیڈنٹ کو یہ سنکر تعجب ہوا اور دریافت کیا کہ بچہ کی پیدائش کے متعلق جو کچھ افواہ سُنی جاتی ہے کیا وہ صحیح ہے؟ اور کیا یہ بھی واقعہ ہے کہ سلیمان جاہ اور محسن الدولہ کو دربار میں آنے کی ممانعت ہو گئی ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ جب بچہ پیدا ہوا تو ولی عہد خاصہ برداروں کے ساتھ شام کو حاضری کے لئے مصر تھے لیکن چونکہ لڑکا ایک دھوبن کے بطن سے پیدا ہوا تھا اس لئے میں نے مراسم مروجہ کی ادائی سے انکار کر دیا۔ اُن کا اس سے مطلب صرف یہ تھا کہ اس ولادت کی شاہی تصدیق ہو جائے۔ رزیڈنٹ نے کہا کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ سلیمان جاہ اور بادشاہ بیگم کے دشمنوں نے یہ خبر تصنیف کر کے آپ تک پہونچائی ہو۔ بادشاہ نے کہا کہ اس مسئلہ کی میں نے پوری تحقیقات کر لی ہے۔

رزیڈنٹ نے ان تمام باتوں کی اطلاع اپنی حکومت کے صدر دفتر (کلکتہ) کو کر دی اور یہ بھی لکھا کہ "ولی عہد تو اپنا باپ ہونا تسلیم کرتے ہیں لیکن بادشاہ اس کو نہیں مانتے"۔

سکریٹری امور خارجہ نے ۱۴ر اکتوبر کو رزیڈنٹ کے مکتوب مورخہ ۱۶ر ستمبر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ اس باب میں پوری تحقیقات کی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ ولی عہد اس نومولود کے حقیقی باپ ہیں یا نہیں۔

رزیڈنٹ نے حکم دیا کہ مفرور دھوبن کے شوہر کا اظہار لیا جائے۔ اس لئے میر منشی نے اس کو نوکر رکھ لیا اور پھر اُس کا اظہار لیا گیا۔ جب دوبارہ بادشاہ کی خدمت میں رزیڈنٹ گئے تو انھوں نے ایک کاغذ بادشاہ کو دیا اور درخواست کی کہ آیندہ قصوں جھگڑوں کا سدباب کرنے کی غرض سے جو کچھ وہ اُس نومولود کے متعلق جانتے ہوں اُسے تحریر فرمادیں اور یہ بھی درخواست کی کہ جہاں پناہ خود محل میں تشریف لے جاکر اُس نومولود کو ملاحظہ فرمالیں۔ لیکن جہاں پناہ نے تحریر دینے سے قطعی انکار کیا اور کہا کہ نومولود اُن کا پوتا نہیں ہے اور اسی لئے انھوں نے حسب رواج قدیم اس موقع پر کوئی مروجہ رسم ادا نہیں کی اور یہ بھی کہا کہ اگر اس نومولود کی پیدائش میں کوئی راز نہ تھا تو بادشاہ بیگم کے پاس کوئی معقول وجہ محل کی دیگر خواتین کو طلب نہ کرنے کی نہ تھی، حالانکہ اس کے متعلق میرا صریحی حکم تھا۔ بادشاہ نے دائی کو طلب کرنے کا حکم دیا اور خود ایک خط اس سلسلہ میں بادشاہ بیگم کو بھی لکھا۔ ان تمام حالات سے پتہ چلتا ہے کہ رزیڈنٹ نے ہر ممکن طریقے سے نفس معاملہ کی صحت کے متعلق جستجو کی۔

وقایع نگاروں نے ۲۵ر جمادی الثانی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۳ر مئی ۱۸۱۷ء کو رزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ بادشاہ نے ۲ کنیزوں کو جنھیں منتظم الدولہ مہدی علی خاں نے نذر کیا تھا۔ میمنت خواجہ سرا کے ذریعہ سے بادشاہ بیگم کے پاس بھیجا تھا جن میں سے دو مرگئیں اور تیسری افضل محل زندہ تھی۔ جو اس نومولود کی ماں تھی اور یہ بھی مطلع کیا گیا کہ نومولود افضل محل کے سینہ سے دودھ پیتا تھا اور ولی عہد اور بادشاہ بیگم کو اطمینان تھا کہ اگر بادشاہ کو کچھ بھی شبہ ہوگا تو وہ زچہ اور بچہ دونوں کو بہ چشم خود ملاحظہ کرلیں گے۔

اس سلسلہ میں پیرا دھوبی نے جو بیان دیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے: "میری ۱۷ سالہ بیوی تقریباً ۸ مہینہ ہوئے غائب ہوگئی ہے، وہ حاملہ تھی۔ یہ واقعہ ۱۷ر اگست ۱۸۲۰ء مطابق ۷ر ذیقعدہ ۱۲۳۵ھ کا ہے دن کے دو گھڑی گزرے تھے کہ وہ پرورش علی کے مکان کپڑے لیکر گئی اور پھر اُس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ دوپہر کو منیا دلالہ میرے مکان آئی اور اُس کے متعلق گفتگو و شنید کی۔ میری ساس نے جواب دیا کہ وہ پرورش علی کے گھر کپڑے لیکر گئی ہے۔ میں گھر چلا آیا اور شام تک اُسکی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ میں پرورش علی کے گھر گیا معلوم ہوا کہ وہ واپس گئی۔ کچھ لوگوں نے مجھ کو خبر دی کہ منیا دلالہ نے پرورش علی کی سازش سے میری عورت کو بیچ ڈالا ہے۔ میں دلالہ کے گھر گیا وہ موجود نہ تھی اُس کے لڑکے نے کہا کہ وہ دو دن سے باہر گئی ہوئی ہے اور ابھی واپس نہیں آئی ہے۔ آخر کار تیسرے دن وہ مجھکو ملی اور میں نے کوتوال سے سب قصہ بتلا کر اُس کو گرفتار کرا دیا۔

۴ دن کے بعد دلالہ نے میری عورت کو واپس لانے کا وعدہ کیا اور وہ چھوڑ دی گئی لیکن اُس کا نام روزانہ حاضری کے لئے کوتوالی میں لکھ لیا گیا۔ کوتوال نے بہت کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی، میں مایوس ہوکر خاموش ہوگیا اور

دلالہ بھی ۴ محرم کو چھوڑ دی گئی - میں اس افواہ پر یقین رکھتا ہوں کہ وہ رنگ محل میں ۱۵۰ روپیہ پر بیچ ڈالی گئی "

رزیڈنٹ نے ۲۰ دسمبر کو یہ بیان گورنر جنرل بہادر کو بھیج دیا اور اُس ملاقات کا بھی ذکر کیا جو اس سلسلہ میں بادشاہ سے ہوئی تھی -

اسی زمانہ میں ایک دن جہاں پناہ نے محسن الدولہ سے دریافت کیا کہ اُن کے ماموں نصیر الدین حیدر شاہی عیادت کے لئے کیوں نہیں آئے، حالانکہ جہاں پناہ کے ٹانگ میں زخم تھا - محسن الدولہ نے جواب دیا کہ وہ جہاں پناہ کے احکام کے منتظر ہیں - جہاں پناہ نے فرمایا کہ جاؤ اُن سے کہو کہ وہ مع نومولود کے فوراً حاضر خدمت اقدس ہوں - محسن الدولہ نے بادشاہ بیگم کو مطلع کیا اور انھوں نے منا جان کو مع نصیر الدین حیدر کے شاہی دربار میں بھیج دیا - ولی عہد بہادر دربار میں تشریف لے گئے شاہی قدموں پر سر رکھنے کا شرف حاصل کیا اور جہاں پناہ نے اُن کو اُٹھا کر سینہ سے لگایا اور بہت روئے اور نومولود کو بھی اپنی آغوش میں لیا اور دونوں کو خلعت عطا کئے اور حسب دستور قدیم رخصت کیا -

مسٹر ریپر منصرم رزیڈنٹ نے اس واقعہ کی اطلاع بھی اُسی دن (۱۰ اپریل ۱۸۳۱ء) کو گورنر جنرل کو دیدی -

اور وجوہ کے علاوہ جو اس نومولود کی ولادت کو مشکوک ثابت کرتے ہیں، ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسٹر میڈرک سابق رزیڈنٹ کے زمانہ میں بادشاہ بیگم نے بیان کیا تھا کہ حمل کی مدت ۲ سال سے زاید بھی ہو سکتی ہے - علاوہ اس کے ایک خبر یہ بھی مشہور تھی جس کی تصدیق نواب معتمد الدولہ نے بھی کی تھی کہ نصیر الدین حیدر پیدائشی ناکارہ تھے اور اسی بنا پر دار السلطنت میں ہر شخص اس سے واقف تھا کہ فریدوں بخت، نصیر الدین حیدر کے نطفہ سے نہ تھا اور اُس کی تبنیت محض اسی بنا پر عمل میں آئی تھی کہ جہاں پناہ لاولد تھے -

منتظم الدولہ کا یہ بیان بھی اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ: نصیر الدین حیدر نے صریحاً یہ بیان کیا کہ کیوان جاہ اور فریدوں بخت اُن کے لڑکے نہ تھے اور یہ کہ انھوں نے لاولد ہونے پر اظہار افسوس بھی کیا تھا - علاوہ بریں نصیر الدین حیدر نے تخت نشین ہونے کے بعد فریدوں بخت کے ولی عہدی کی تصدیق نہ کی تھی بلکہ کیوان جاہ کو جو اُن کے لڑکے نہ تھے ولی عہدی کے لئے نامزد کیا تھا -

ان حالات کی اطلاع بھی یکم جنوری ۱۸۳۱ء - ۱۶ رجب ۱۲۴۶ھ کو رزیڈنٹ نے گورنر جنرل کو دیدی تھی -

کچھ افراد جو اس مقدمہ کے واقعات سے باخبر تھے وہ کانپور میں رہتے تھے اس لئے مندرجۂ ذیل بیانات مسٹر اولڈ فیلڈ جج کانپور نے وہاں اُن لوگوں نے حاصل کئے -

بیان پرورش علی خاں : "منیا دھوبن جو ذی الحجہ میں میرے مکان پر کپڑے دھو کر لائی تھی - اُسوقت بادشاہ بیگم کی خادمہ بدھی خانم معروف بہ امانی خانم جو میرے یہاں آکر مہمان رہتی تھیں آئی تھیں - میری موجودگی میں انھوں نے منیا سے کہا کہ تم حاملہ ہو لیکن تمھارے مرد سے تمھاری بنتی نہیں ہے، محل میں ایک حاملہ عورت کی تلاش ہو رہی ہے میں تم کو بیگم صاحب کے پاس پہونچا دوں، اگر خوش قسمتی سے لڑکا ہوا تو تمام دنیاوی عیش و آرام مہیا کیا جائے گا - چونکہ منیا اپنے مرد سے خوش نہ تھی اس لئے وہ اور بدھی خانم دونوں ایک محافہ میں بیگم کے محلسرا چلی گئیں - مرزا عنایت علی محافہ کے ساتھ محلسرا کی ڈیوڑھی تک گیا - مرزا ابھی لکھنؤ میں رہتا ہے - میں اس ماہ کی چوتھی کو بدھی خانم سے ملا وہ بخار میں مبتلا تھی اور ساتویں کو اُس کا

انتقال ہو گیا۔

سوال ۔ مُنیا کے محل میں جانے کے کتنے دنوں بعد تم کو معلوم ہوا کہ مُنیا کے بچہ ہوا ہے ؟

جواب ۔ ۱۵ یا ۱۶ دن بعد۔

مرزا عنایت علی کا بیان : "ذی الحجہ کے مہینہ میں (دن تاریخ مجھکو یاد نہیں) ایک دن پرورش علی خاں کی ڈیوڑھی پر بیٹھا تھا کہ امانی خانم، بادشاہ بیگم کی خادمہ آئیں اور مجھ سے کہا کہ میں اُن کے ہمراہ محلسرا تک چلا چلوں، میں نے اُس عورت کے متعلق تفتیش کی جو امانی خانم کے ساتھ تھی تو معلوم ہوا کہ وہ پیرا دھوبی کی عورت تھی اُس کا نام منیا تھا۔ چونکہ میں منیا دھوبن کو جانتا تھا اس لئے میں نے دریافت کیا کہ حاملہ عورت کو محل میں لے جانے سے کیا فایدہ ہے، مجھ کو جواب ملا کہ محل میں آجکل اسی قسم کی ایک عورت کی شدید ضرورت ہے۔ وہ دونوں ایک محافہ میں بیٹھیں اور میں محلسرا کے پھاٹک تک ساتھ گیا۔ گو اُن لوگوں نے مجھ کو بڑی رقمیں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ایک چھدام بھی نہ دی۔

سوال ۔ تمھاری دانست میں محل میں جانے کے منیا کے کتنی مدت بعد لڑکا ہوا ؟

جواب ۔ ۱۵ ۔ یا ۱۶ دن کے بعد۔

شیخ زین اللہ کا بیان : "میں امانی خانم کی ملازمت میں تھا وہ ایک حاملہ عورت بادشاہ بیگم کی خدمت میں لے گیں اور مجھ کو حکم تھا کہ میں ساتھ جاؤں، محلسرا کی ڈیوڑھی تک میں بھی ہمراہ گیا تھا۔

سوال ۔ مُنیا کے محل میں جانے کے کتنے دنوں بعد تمھارے علم میں بچہ ہوا ؟

جواب ۔ ۱۵ یا ۱۶ دن کے بعد۔

مسماۃ مہتاب قابلہ کا بیان : بادشاہ بیگم نے مجھے طلب کر کے محل میں رہنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ سکھ چین خواص حاملہ ہے میں اکثر سکھ چین کے بستر پر اُس کے ساتھ سوئی اُس کے پیٹ پر بھی بارہا ہاتھ پھیرا لیکن میں نے اُس میں کوئی آثار حمل کے نہ پائے۔ ۹ ماہ بعد بیگم صاحبہ مجھ سے ناراض ہوگئیں اور جواب طلب کیا کہ اب تک بچہ کیوں پیدا نہ ہوا ؟

میں نے جواب دیا کہ جب رحم مادر میں کوئی بچہ نہیں ہے تو وہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس جواب سے اُس کا غصہ بھڑک اُٹھا اور مجھے باہر بھیج دیا۔

ایک دن ۴ گھڑی رات گزری ہوگی کہ فیض النسا میرے پاس آئیں اور کہا کہ سکھ چین کے درد شروع ہو گئے ہیں اور میری خوش نصیبی پر مجھکو مبارک باد بھی دی، میں اُن کے ساتھ سکھ چین کے پاس گئی وہاں کوئی آثار وضع حمل کے نہ تھے، مجھ کو مایوسی ہوئی لیکن سزائے موت کے ڈر سے خاموش رہی۔ ایک گھڑی کے بعد یہ اطلاع دی گئی کہ لڑکا پیدا ہو گیا ہے میں محل واپس چلی گئی مجھ کو اچنبھا ہوا۔ فیض النسا اور دوسری مغلانیاں بچہ کو میرے پاس لائیں، میں نے اُس کی نال کاٹی اور ہزار روپیہ اور جڑاؤ کنگن انعام پایا، میں نے تیل اور کپڑا زچہ کی مالش کے لئے طلب کیا لیکن مجھکو جواب ملا کہ یہ رسم غربا کے یہاں رائج ہے اور امرا کے یہاں یہ دستور نہیں ہے۔ فیض النسا نے ۲۰۰ روپیہ مجھ سے اُسی وقت لے لئے ۸۰۰ میرے پاس بچے تھے۔ جب شاہ زمن غازی الدین حیدر نے مجھ سے یہ ماجرا دریافت کیا تو میں نے یہی ان سے بھی کہدیا تھا۔

سوال ۔ بچہ کی پیدائش کس سال اور کس مہینہ اور کس دن ہوئی ؟

جواب ۔ غالباً ذی الحجہ کا مہینہ تھا۔ دن تاریخ تو اچھی طرح یاد نہیں ہے ۔

سوال ۔ جب بچہ پیدا ہوا تو کیا یہ تم کو علم ہوا کہ اُس کی ماں کون ہے ؟

جواب ۔ ۸ ۔ ۹ دن کے بعد فیض النسا نے مجھ سے کہا افواہ ہے کہ یہ دھوبن کے پیٹ سے ہے تو اُس پر میں نے کہا کہ ناحق بنے ایک دھوبن کے لڑکے کی نال کاٹی ۔ اس جواب پر فیض النسا خفا ہوگئیں اور بگڑ کر کہنے لگیں۔ تجھ کو ہمیشہ یہی کہنا چاہئے کہ یہ سکھ چین کے پیٹ سے ہے ۔ میں نے جواب دیا میں ناحق جھوٹ کیوں بولوں !

دلاور خاں کا بیان : میں شاہ زمن غازی الدین حیدر شاہ اودھ کا قدیم نمک خوار ہوں جب مُنیا دھوبن قید کیگئی تو وہ میرے ہی حراست میں تھی ۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ تو کیوں قید کی گئی ہے تو اُس نے جواب دیا کہ " وہ پیرا دھوبی کی عورت ہے اور جب وہ حاملہ تھی تو بادشاہ بیگم کی مغلانی امانی خانم اُس کو دھوکہ سے محل لے گئی ۔ جب اُس کے بچہ ہوگیا تو نوبتی خانم مغلانی اُس کو اپنے گھر لے گئیں اور جن دواؤں کی اُس وقت ضرورت تھی اُنھوں نے کیں، اور اُس کی دیکھ بھال بھی کی ۔ شاہی ملازم اُس کی تلاش میں تھے ۔ مغلانی نے مجبوراً اُس کو عباس بیگ کے حوالہ کر دیا جو اُس کو معتمد الدولہ کے پاس لے گیا ۔ معتمد الدولہ نے اُس کو فرح بخش بادشاہ کی خدمت میں تحقیقات کے لئے بھیجدیا ۔ عباس بیگ کو تھوڑی دیر کے لئے سپاہیوں کے دستہ کی حراست میں بھی رہنا پڑا تھا " شاہی احکام کی رو سے میں مُنیا کو معتمد الدولہ کے پاس سے گیا ۔ کچھ دنوں سے اب میں کانپور میں مقیم ہوں، اس مہینہ کی ساتویں کو مجھ سے ایک لاش دیکھنے کے لئے کہا گیا تھا میں نے شناخت کی کہ وہ لاش مُنیا دھوبن کی تھی ۔

نوبتی خانم کا بیان : میں خوب واقف ہوں کہ منا جان سکھ چین کے پیٹ سے نہیں ہیں، وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہی اور کبھی کوئی بچہ اُس کے پیدا نہیں ہوا ۔

سوال ۔ زچگی کے لئے کس قابلہ کو طلب کیا گیا تھا ؟

جواب ۔ مسماۃ مہتاب دائی بلائی گئی تھی ۔

سوال ۔ کیا تم نے سکھ چین کو زچگی کے بعد دیکھا تھا

جواب ۔ ہاں میں نے اُس کو محل میں اچھے خاصے طریقے سے چلتے پھرتے دیکھا تھا ۔

معتمد الدولہ نے رزیڈنسی کے دفتر میں جو رپورٹ پیش کی اس کا خلاصہ یہ ہے :

" جب بادشاہ بیگم نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ سکھ چین حاملہ ہے تو بادشاہ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ بغیر میری ایما کے یہ لڑکی نصیر الدین حیدر کے پاس کیوں بھیجی گئی کیونکہ لارڈ ہسٹنگس اور میری رائے تھی کہ نصیر الدین حیدر کی شادی کسی معزز امیر کی لڑکی سے کی جائے تاکہ پہلا لڑکا نجیب الطرفین ہو، بادشاہ نے مقررہ مدت ۹ ماہ تک انتظار کیا اور جب کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ یہ چال سمجھ گئے اور انھوں نے بادشاہ بیگم کے پاس پیام بھیجا کہ " بچہ کی ولادت میں اس قدر تعویق حیرت ناک ہے " اُنھوں نے جواب دیا کہ بچہ پیدا ہونے کے لئے طیار ہے لیکن ارواح خبیثہ اُس کی ولادت میں ہارج ہیں ۔ اس جواب سے بادشاہ کے شبہات قوی تر ہوگئے ۔ جہاں پناہ نے حکم دیا کہ بچہ کی پیدائش اُن کی بہنوں، پھوپھیوں اور دوسری محل کی معزز بیگمات کے سامنے ہونا چاہئے ۔ اس امر کو بھی ۲۰ ماہ گزر گئے ۔ بادشاہ کے شکوک بڑھتے گئے اس عرصہ میں

یہ افواہ بھی گرم ہوئی کہ محل میں بادشاہ بیگم کے ملازمین کسی حاملہ عورت کی تلاش میں ہیں اور یہ کہ ایک حاملہ دھوبن جو محمد باقر کے ملازمت میں تھی غائب ہے۔ یہ افواہ سنکر بادشاہ نے دوسرا پیام بادشاہ بیگم کو بھیجا کہ بچہ کی پیدائش کے وقت خانوادہ منصوریہ کی جملہ بیگمات کو مدعو کیا جائے تاکہ بچہ اُن کی موجودگی میں پیدا ہو، کچھ دنوں کے بعد دفعتاً جہاں پناہ کو بچہ کی پیدائش کی اطلاع ہوئی اور ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی کہ ولی عہد بہادر نذر پیش کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں اور یہ بھی سُنا گیا کہ ولی عہد بہادر حسب دستور قدیم شاہی محل میں نومولود کی پیدائش کی تصدیق کے لئے سلامی کی توپیں سر ہونے کی استدعا بھی کرینگے جہاں پناہ نے ناراض ہو کر فرمایا کہ اگر یہ میرا پوتا ہوتا تو توپوں کی سلامی ضرور ہوتی۔ ولی عہد بہادر یہ سنکر مایوس واپس چلے گئے

کچھ عرصہ کے بعد ولیعہد اور محسن الدولہ اُس بچہ کو جہاں پناہ کے حضور میں لے گئے اور بادشاہ نے غصہ سے اُس بچہ کی شکل دیکھنے سے انکار کر دیا اور اس واقعہ کی اطلاع منتظم الدولہ کے ذریعہ سے رزیڈنٹ کو بھی دیدی تھی رزیڈنٹ نے اس کو سُنکر کہا کہ میں نے سنا ہے کہ بادشاہ نے بچہ کو گود میں لیا تھا۔ لیکن منتظم الدولہ نے جواب دیا کہ کسی شخص نے رزیڈنٹ کو غلط اطلاع دی ہے۔ منصرم رزیڈنٹ کرنل رپیر اور مسٹر ریکٹ رزیڈنٹ کے عہد حکومت میں بھی بادشاہ نے ان واقعات کی اطلاع دیدی تھی کہ یہ بچہ نصیر الدین کے نطفہ سے نہ تھا۔

اس کے بعد دوبارہ بادشاہ بیگم نے اعلان کیا کہ سکھ چین حاملہ ہے بادشاہ بیگم نے شاہی طبیب اور ایک فرنگی ڈاکٹر کو ایک ہندوستانی ڈاکٹر کے ساتھ اس خبر کی تصدیق کے لئے محل میں بھیجا لیکن بادشاہ بیگم نے اس معاینہ کی اجازت نہ دی سکھ چین کے حمل کی داستان ۴ سال تک مشہور رہی لیکن کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔

مسٹر میڈک اور کرنل لو کے زمانہ میں تحقیقات کی کارروائی روک دی گئی تھی۔ منتظم الدولہ مہدی علی خاں شعبان ۱۲۴۷ھ ۲ فروری ۱۸۳۲ء کو تاج الدین خاں کے ساتھ رزیڈنٹ سے ملے اور اس سلسلہ میں کچھ مزید معلومات کا اظہار کیا اور انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ کیوان جاہ اور مُنا جان کے متعلق جو کچھ آپ سے گزشتہ زمانہ میں کہا گیا تھا وہ جہاں پناہ کی جانب سے نہ تھا۔ لیکن اب جو اطلاع دی جا رہی ہے وہ شاہی احکام کے موجب ہے، جہاں پناہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ دونوں لڑکے اُن کے نہیں ہیں اور وہ دونوں کو محل سے علٰحدہ کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ دولت خانہ یا اور کہیں باہر جا کر رہیں یہ سنکر رزیڈنٹ نے پوچھا کہ:

جہاں پناہ کو کیسے معلوم ہوا کہ فریدوں بخت اُن کے لڑکے نہیں ہیں اور یہ کہ اُن کے خیال میں فریدوں بخت کا باپ کون ہے؟

رزیڈنٹ نے نواب منتظم الدولہ کو یہ بھی یاد دلایا کہ ایام گزشتہ میں بھی اُن کو کچھ اس سلسلہ میں شکوک تھے، نواب منتظم الدولہ نے جواب دیا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ جہاں پناہ کے والد کے حیات میں نصیر الدین حیدر ایک دن محل میں گئے اور انھوں نے میر فضل علی کو افضل محل سے کچھ بے عنوانیاں کرتے دیکھا وہ اُسی وقت دونوں کو قتل کر دینا چاہتے تھے لیکن میر فضل علی معًا محل سے بھاگ گیا اور بادشاہ بیگم نے دونوں کی جان بچائی، یہ امر نصیر الدین حیدر کو حد درجہ ناگوار گزرا اور وہ محل چھوڑ کر معتمد الدولہ کے ساتھ چلے گئے اور تین دن وہیں رہے، لیکن شاہی احکام کے موجب اُن کو محل میں واپس جانا پڑا۔ دوسری بار دوبارہ انھوں نے محل چھوڑا اور حُسن باغ میں اقامت اختیار کی۔ اس کے بعد بادشاہ بیگم نے افضل محل سے تجدید تعلقات کی پھر سعی کی اور مختلف ذرایع سے وہ حاملہ بھی ہو گئی۔ اس شرمناک واقعہ کے ۲۶ ماہ بعد فریدوں بخت پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں نصیر الدین افضل محل کے پاس نہیں گئے اس طرح وہ اور بادشاہ دونوں مطمئن ہیں کہ فریدوں بخت اُن کا لڑکا نہیں ہے۔ کیوان جاہ کے متعلق بھی منتظم الدولہ نے کچھ واقعات بیان کئے

اور کہا کہ بادشاہ حد درجہ شرمندہ ہیں کہ بادشاہ کی طرف سے کہ وہ فریدوں بخت کو رزیڈنسی دعوت میں نہیں لے گئے بادشاہ بیگم کو بہت قلق ہوا اور سارا الزام انھوں نے مجھ پر لگایا حالانکہ بادشاہ نے خود فرمایا تھا کہ فریدوں بخت کے دعوت میں نہ لیجانے کے وہ خود ذمہ دار ہیں اور میرا کوئی دخل نہ تھا، لیکن بادشاہ بیگم نے یہ بات تسلیم نہ کی اور وہ مجھ سے ناراض ہوگئیں انھوں نے بہت سی خبریں بھی مشتہر کی تھیں کہ "منتظم الدولہ دو گھنٹہ سے زیادہ نہ رہیگا" اور معتمد الدولہ کو دربار میں واپسی کا حکم بھی صادر کر دیا گیا تھا۔ بادشاہ بیگم کا قاصد جو ساحل گنگا پر گرفتار کر لیا گیا تھا وہ ہنوز حراست میں ہے وہ اس واقعہ کے متعلق اظہار رائے کر سکتا ہے۔ جہاں پناہ چاہتے ہیں کہ بادشاہ بیگم دار الخلافت کو چھوڑ کر کہیں اور جا کر رہیں اور زیادہ بہتر ہوگا کہ اگر وہ فیض آباد میں قیام کریں۔

رزیڈنٹ نے ۲۵ فروری کو ان تمام واقعات کی اطلاع صدر دفتر کو دیدی اور ۲۶ فروری مطابق ۱۰ رمضان کو منتظم الدولہ رزیڈنٹ اور بادشاہ میں ڈنر کے بعد ایک کانفرنس ہوئی، رسمی گفتگو کے بعد جہاں پناہ نے سرمندگی سے کہا، بیس دن کے بعد ماہ صیام ختم ہو جائے گا اور قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ فریدوں بخت اور کیوان جاہ شاہی ساز و سامان کے ساتھ مسجد آصفی میں نماز عید کے لیے جایا کرتے تھے۔ لیکن ہم یہ رسم منسوخ کر دینا چاہتے ہیں۔ رزیڈنٹ نے اپنی اور نیز گورنر جنرل بہادر کی ہمدردیوں کا یقین دلاتے ہوئے اس رسم قدیم کے منسوخ کر دینے کی وجہ دریافت فرمائی، نواب منتظم الدولہ بہادر نے جہاں پناہ سے شاہی وجوہ بیان کرنے کی استدعا کی۔ بادشاہ نے نہایت صفائی سے کہا کہ میں آپ کو بہ حیثیت ایک دوست تصور کرتے ہوئے یہ مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ فریدوں بخت اور کیوان جاہ میرے لڑکے نہیں ہیں۔ اور دوسرے امور کے متعلق نواب معتمد الدولہ نے آپ کو مطلع کر دیا ہوگا۔ اس کی تفصیل بھی وہی سب بتلائیں گے اس کے بعد نواب معتمد الدولہ نے جملہ واقعات دوبارہ تفصیل سے بیان کئے۔ اس کے بعد جہاں پناہ نے فرمایا کہ یہ افواہ کہ دونوں میرے لڑکے ہیں، بالکل غلط ہے۔

رزیڈنٹ نے نواب گورنر جنرل بہادر کو ان تمام واقعات سے مطلع کر دیا۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے رزیڈنٹ کو حکم دیا کہ چونکہ جہاں پناہ لاولد ہیں اس لئے مناسب امر یہ ہے کہ نواب سعادت علیخاں کی اولاد نرینہ میں سے سب سے بڑی ہستی جو موجود ہو اس کو جانشینی کے لئے نامزد کیا جائے۔

مشیر احمد علوی

(باقی)

"نگار" کے پرانے پرچے

۱۹۲۶ء:- جنوری عہ - ۱۹۲۷ء:- اگست عہ - ۱۹۲۸ء:- مئی عہ - جون عہ - ۱۹۳۰ء:- مئی ۱۲ - ۱۹۳۱ء:- جولائی تا دسمبر ۸ رنگی پرچہ - ۱۹۳۲ء:- جنوری ۱۲ ر - فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، دسمبر، نومبر ۸ رنگی پرچہ - دسمبر عہ - ۱۹۳۳ء:- فروری ۱۹۳۴ء:- فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ رنگی پرچہ - ۱۹۳۶ء:- دسمبر ۱۲ ر - ۱۹۳۷ء:- فروری، مارچ ۱۲ ر رنگی پرچہ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ رنگی پرچہ، ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۱۲ رنگی پرچہ - ۱۹۳۸ء:- فروری اپریل تا دسمبر ۴ رنگی پرچہ ۱۹۳۹ء:- فروری تا جولائی ۴ رنگی پرچہ - اکتوبر و نومبر ۸ رنگی پرچہ -

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلہ والمناظرہ

اُردو کا جدید رسم خط

مکرمی نیاز صاحب

آپ نے مارچ کے نگار میں رسم الخط کے متعلق میرا مضمون اور رسم الخط کے نمونے شایع کیے۔ شکریہ۔ آپ نے اِس جدید رسم الخط پر جو تنقید کی ہے اُس کا بھی شکریہ۔ لیکن اس تنقید کے متعلق مجھے کچھ کہنا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اگر آپ غور سے میرے جوابات دیکھیں گے تو بڑی حد تک میری رائے سے اتفاق کر لیں گے۔

۱۔ آپ کہتے ہیں کہ ٹائپ کی کامیابی کا انحصار کم سے کم حروف تہجی پر ہے، اور اس رسم خط میں ۴۲ حروف ہیں۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ کم سے کم حروف والا ٹائپ زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے، لیکن میرے ایجاد کردہ رسم خط میں حروف کی تعداد زیادہ نہیں اس لئے کہ یہ تعداد انگریزی کے مقابلہ میں پھر بھی کم ہے کیونکہ انگریزی حروف کی تعداد اگرچہ بظاہر ۲۶ ہے لیکن عملی اعتبار سے یہ تعداد ۵۲ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ چھوٹے بڑے دونوں قسم کے حرفوں سے یکساں طور پر کام لیا جاتا ہے، ناموں کی ابتدا بڑے حرفوں سے ہوتی ہے، ہر جملہ بڑے حرف سے شروع ہوتا ہے اس کے علاوہ اور بھی متعدد صورتوں سے بڑے حرفوں کا استعمال ضروری ہوتا ہے، لہذا اس رسم خط کا ٹائپ جاننے میں انگریزی سے کچھ زیادہ دقت صرف نہ ہوگا۔

۲۔ آپ لکھتے ہیں کہ اس نقص کو دور کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ زبان کو املا کی پابندی سے آزاد کر دیا جائے میرے خیال میں زبان کو املا کی پابندی سے آزاد کرنا رسم خط ایجاد کرنے والے کا کام نہیں بلکہ یہ خود اہل زبان کا کام ہے۔ اگر اُردو زبان کے مستند اصحاب اور ادارے اس پر اتفاق کر لیں تو یہ حرف رسم خط خود بخود الگ ہو جائیں گے، مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا لسانی اعتبار سے ایک ایسی زبان کے لئے کہاں تک درست ہے جس میں پچاس سے لے کر پچہتر فی صد تک عربی اور فارسی الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اور یہ زبانیں ابھی تک زندہ ہیں، اور اسی رسم خط میں لکھی جاتی ہیں۔ جس میں ہماری اُردو لکھی جاتی ہے لہذا س، ص، اور ث کی جگہ صرف س کو اور اسی طرح ت اور ط کی جگہ صرف ت کو قایم رکھنا اصولاً غلط ہوگا، الفاظ کے ماخذ اور اس کے مشتقات کو سمجھنے کے لئے الفاظ کو اسی املا سے لکھنا ضروری ہے جس املا میں وہ اصل زبان زبانوں میں لکھے جاتے ہیں

۳۔ آپ لکھتے ہیں کہ ی میں صرف ی کافی ہے چھوٹی اور بڑی کی تعیین کچھ نہیں" یہ تجویز تو کسی طرح صحیح نہیں اس لئے کہ چھوٹی ی یائے معروف کا تلفظ بتاتی ہے اور بڑی ے یائے مجہول کا، اور جب کہ یہ دونوں حرف بالکل علیحدہ علیحدہ تلفظ کی نمایندگی کرتے ہیں تو اُن کی شکلیں بھی علیحدہ علیحدہ ہونی چاہئیں۔ ورنہ لڑکے اور لڑکی کے تلفظ کا فرق کس طرح بنایا جائے گا۔

۴۔ آپ لکھتے ہیں کہ نون غنہ کے لیے "نون کا نقطہ اڑا دینا کافی ہوگا"۔ یہ ممکن تو ہے۔ مگر ایسا کرنے سے حرفوں کا باہمی التباس بڑھ جائے گا، اس لئے کہ اگر ۲۰ یا ۲۰ کے نقطے لگانا بھول جائیں تو محاورے سے صحیح لفظ پڑھ لیں گے۔ لیکن نون غنہ پر نقطہ نہ لگانے سے التباس کی ایک صورت اور بڑھ جائے گی، اس لئے نقطہ اور علامت دونوں کے ساتھ اُن کا لکھنا زیادہ ٹھیک ہوگا، اور آپ کی تجویز سے کوئی حرف کم بھی نہیں ہوتا، غنہ کے اظہار کے لئے علیحدہ حرف رکھنا لازمی ہے خواہ وہ بغیر نقطے کے ہو یا نقطے کے ساتھ۔

۵۔ آپ لکھتے ہیں کہ "واؤ مخلوط کا تلفظ ہماری زبان میں نہیں"، میرا مطلب واؤ معروف سے واؤ کا وہی تلفظ ہے جو کمزور ہوتا ہے جیسے بوا، ہوا اب اس کمزور واؤ کو خواہ مخلوط کہئے یا کچھ اور مگر اس کی علیحدہ رکھنا ضروری ہے۔

۶۔ آپ کھینچے ہوئے زیر اور پیش کے لئے علامت چاہتے ہیں، لیکن دراصل اس کی کوئی ضرورت نہیں، زبر، زیر اور پیش کا کھینچا ہوا تلفظ الف، ی اور واؤ معروف۔ بنے یا مجہول، گولا اور بوٹا کی مثال غلط ہے، گولے میں واؤ مجہول ہے اور بوٹے میں معروف، جن کے لئے رسم خط میں علیحدہ علیحدہ شکلیں موجود ہیں۔

۷۔ دھ، ٹھ، اور گھ وغیرہ کا تلفظ، آپ کہتے ہیں، د، ت اور گ وغیرہ میں کچھ تغیر کرکے پیدا کرنا چاہئے۔ آپ کی یہ تجویز بھی درست نہیں، اس لئے کہ پھر وہی حروف کی کثرت کا سوال پیش آجائے گا، جس کی آپ کو پہلے سے شکایت ہے، کیونکہ ہائے مخلوط والے حرف دس ہیں، اور اُن کو علیحدہ رکھنے سے تعداد ۴۲ سے ۵۲ ہو جائے گی۔

۸۔ آپ کہتے ہیں کہ الف ٹیڑھی کھیر ہے لیکن خود آپ نے گ کی جو شکل بنائی ہے وہ بھی کچھ کم ٹیڑھی کھیر نہیں، در اصل یہاں دشواری اس وجہ سے پیش آئی ہے کہ مرکز والے ک کو ٹائپ کی نشست میں بٹھانا مشکل تھا، اس لئے یہ شکل تجویز کی گئی تاکہ اصل سے قریب تر رہے، البتہ زیادہ آسانی کے لئے ک کو یوں ﮎ لکھ سکتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میرے یہ تمام جوابات آئندہ پرچے میں شایع کردیں گے، تاکہ پڑھنے والوں کو اس رسم خط کے صحیح اصول سے واقفیت ہو سکے اور اُن کو اپنی رائے دینے میں آسانی ہو۔

محمود علی خاں (بی اے) پھوپانی

(نگار) (۱) یہ صحیح ہے کہ انگریزی میں بڑے چھوٹے حروف ملاکر ۵۲ ہو جاتے ہیں، لیکن بڑے حروف کا استعمال بہت کم ہوتا ہے اور آپ کے یہاں بھی کا استعمال بکثرت ہوگا، علاوہ اس کے ٹائپ رائٹر میں انگریزی کے بڑے چھوٹے حروف ایک ہی کمانی سے متعلق ہوتے ہیں، اور آپ کے رسم خط پر اگر ٹائپ رائٹر طیار کیا گیا تو اس میں یہ آسانی ممکن نہ ہوگی۔

(۲) الابد لنے کا طرفدار تو میں بھی نہیں ہوں، لیکن رسم خط کی تبدیلی کے ساتھ یہ سوال بھی ضرور سامنے آتا ہے، کیونکہ غیر ملک والوں کو زبان سیکھنے میں آسانی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ الفاظ کے مخارج کو نظر انداز کرکے صرف صوتی (Phonetic) اصول پر رسم خط قائم کیا جائے۔

(۳) چھوٹی ڈ ی اور بڑی ی کے فرق کو علامات حرکت سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

ہندی میں زیر کی تین صورتیں ہیں:-

کہ (کاف بیانیہ) =

کی (یائے معروف) =

کے (یائے مجہول)

میرا مدعا تھا کہ یائے معروف و یائے مجہول کو صرف علامات حرکت سے ممیز کیا جائے۔

(۴) نون غنہ کے لئے علیحدہ حرف ٹائپ میں رکھنا طوالت سے خالی نہیں۔ چونکہ ٹائپ رائیٹر میں نقطوں کے لئے علیحدہ کمانی مقرر کر سکتے ہیں، اس لئے ہم کو اختیار ہوگا کہ جب چاہیں اسے ن، ت، ث بنا دیں اور جب چاہیں نون غنہ کر دیں۔

(۵) واؤ معروف کا تعلق آپ کی واؤ مخلوط سے بالکل نہیں ہے۔ واؤ معروف اور واؤ مجہول کے متعلق تو میں نے خود ظاہر کیا ہے کہ ان کے لئے علامات علیحدہ علیحدہ ہونا چاہئے۔

(۶) کھینچے ہوئے زیر اور پیش کا تلفظ محض ی اور واؤ سے ظاہر ہو سکتا۔ یِی اور یے یا کُو اور کو کا فرق آپ صرف ی اور واؤ سے کیونکر ظاہر سکتے ہیں۔

(۷) ہائے مخلوط کے متعلق بیشک آسانی اسی میں ہوگی کہ اسے علیحدہ حرف کی حیثیت سے رکھا جائے۔

(۸) کاف کی شکل کا سوال زیادہ اہم نہیں۔

آپ کے مضمون کو دیکھ کر ایک شخص نے دہلی کے کسی صاحب کا تجویز کیا ہوا رسم خط پیش کیا ہے اور اسے قابل ترجیح قرار دیتے ہیں۔ اگلے مہینے اسے بھی پیش کرونگا۔

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعات طاق بستاں

بہترین انتقادی لٹریچر

خواب کی دنیا:- خواب کی دنیا کی وسعت سچ پوچھئے تو بیداری کی دنیا سے زیادہ ہے لیکن ہم کو اسوقت تک یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اسکی نوعیت کیا ہے حقیقت کا علم کجا؟ ہر زمانہ اور ہر ملک میں لوگوں نے کوشش کی کہ خواب کیوں نظر آتے ہیں، انکی علمی اور نفسیاتی یا روحانی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے اور تعبیر کوئی معنی رکھتی ہے یا نہیں، چنانچہ انھیں سوچنے والوں میں سے ایک شخص سگمنڈ فرائیڈ بھی تھا اس نے اپنی ساری عمر اسی تحقیق میں بسر کر دی اور آخر میں ایک کتاب لکھ کر خود بھی اسی خواب کی دنیا میں چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اردو میں پیش کیا ہے

قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ (ص ۱۰)

الہامات شاد:- شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن اگر آپ انکے کلام کا انتخاب سہ ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمایئے قیمت علاوہ محصول ۸ر

اقبال کی شاعری:- یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے اقبال پر اردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے اسکی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

مکتوباتِ نیاز

"تو، وطوبیٰ و ما و قامتِ دوست!" بجا ارشاد ہوا۔ اس سے غالباً طوبیٰ ہی کو فخر حاصل ہوا ہوگا، "قامتِ دوست" کا مرتبہ تو اس سے کہیں بلند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر انسان اس قدر برخود غلط نہ ہو تو دنیا ویران ہو جائے، دو باتیں عرصہ سے سنتا چلا آتا تھا۔ ایک یہ کہ دنیا کا کوئی انسان پورا انسان نہیں، دوسرے یہ کہ حسن کا تعلق صرف "محالات" سے ہے۔ یعنی اچھے سے اچھے انسان کیطرف سے بھی ہر وقت بدتمیزی کی توقع رکھنا چاہیئے اور حسن نام ہے صرف "عدم دسترس" کا۔ اب آپ اور آپ کے "قامتِ دوست" نے ان دونوں کا یقین دلا دیا بہرحال آپ انسانِ کامل بنیں یا نہ بنیں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تصدیق ہونے کے لئے "قامتِ دوست" کا سایہ آپ کو ایکبار ضرور میسر آجائے!

خدا آپ کو صحیح و سلامت رکھے، کہ اس بیسویں صدی میں قیس و فرہاد کا نام آپ ہی کے دم سے زندہ ہے اور نہ یونتو دنیا میں آپ کی طرح بہت سے بیفکرے نظر آتے ہیں، لیکن "عشق" کا سلیقہ کسی کو حاصل نہیں!

یہ آپ نے خوب لکھا کہ "آزمائش شرط ہے" یہ اشتہار والی ذہنیت آپ میں کیونکر پیدا ہوگئی۔ آپ کو معلوم ہے میں ..... مرحوم کی اخبار نویسی کو صرف اس لئے پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ "انتقال" کے ساتھ "پر ملال" اور "حضور" کے ساتھ "فیض گنجور" ضرور لکھتے تھے اور اپنے اخبار میں اشتہارات حاصل کرنے کے لئے اس فقرہ کے علاوہ کبھی کچھ نہیں لکھا کہ "اس میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے"

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ معاملہ خاص میں کہاں تک اُن پر اعتماد کیا جائے، آپ فرماتے ہیں "آزمائش شرط ہے" معقول! اس کے بعد یہ بھی کیوں نہ لکھدیا کہ "فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس"!

یہ تو میں جانتا تھا کہ معاملہ کو معاملہ کی طرح طے کرنا آپ کی ضعیف قوتِ ارادی سے مشکل ہے، لیکن رائے دینے میں اس قدر الجھاؤ کا اندیشہ کبھی نہ تھا۔

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ "احتیاط" اور "دھوکے" میں تھوڑا ہی سا فرق ہے! ازراہ کرم میرے پچھلے خط اور پھر پڑھیئے اور پھر اس کا جواب دیجئے۔

آپ بھی عجیب چیز ہیں۔ "لب لعل و خط زنگاری" کی فکر تو اتنی لیکن "کاروبار دلداری" میں جو اور ہزاروں

نکتے پوشیدہ ہیں، ان کی خبر نہیں، انسان یونہی ہر وقت اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہتا ہے، لیکن عورت اور مذہب کے باب میں اس کا دھوکا ایک مستقل فتنہ ہے۔ کوئی ان میں سے کسی ایک میں مبتلا ہوگا، آپ ماشاء اللہ دونوں کے مارے ہوئے ہیں۔ تہجد سے لیکر عشار کے آخری تشہدؔ تک آپ کو انسانیت میں آنے کی ایک لمحہ فرصت نہیں! خدا رحم کرے!

نصیحت کا مجھے حق نہیں، ہمدردی کی آپ کو ضرورت نہیں، پھر اس کا ذکر مجھ سے بار بار کیوں؟ شاید اس لئے کہ میں آپ کی اس زندگی سے نصیحت اٹھاؤں، لیکن غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ

مستیم را نبود نغمہ وصہبا ساماں!

جب بے سروسامانی اس حد تک پہونچ جائے کہ "دعوتِ برگ و نوا" سے نینوا یاں اور بڑھنے لگیں تو پھر سوائے فاتحہ پڑھ دینے کے اور کیا چارہ ہے۔ غالبؔ کا ایک شعر سنئے:۔

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن
زخود رفتیم و باہم خویشتن بردیم دنیا را

اللہ، اللہ! وہ یاد فرمائیں اور میں کچھ نہ کہوں، وہ میرا ذکر کریں اور میں اپنے آپ میں رہوں!

شاد باش اے دل کہ آخر عقدہ ات وا می شود
قطرۂ ما می رسد جائے کہ دریا می شود!

تسلیم غائبانہ پہونچا دیجئے اور کہہ دیجئے کہ گو میرا قافلۂ دل، جرس سے خالی ہے، لیکن خدمتِ فریاد بجا لانے کی تمنا سے خالی نہیں۔

باہمہ کلفت و دوری بہ ہمیں خورسندیم
کہ در آئینہ ما حسرتِ دیدارے ہست!

بندہ نواز، محبت کی نگاہ بھی الگ ہوتی ہے اور زبان بھی، پھر میں کیونکر یقین کروں کہ آپ کو میرے ساتھ لاگ نہیں، لگاؤ ہے؟ آپ یہاں ہوں تو ملیں نہیں، وہاں ہوں، تو کسی سے پوچھیں نہیں، اور پھر اصرار یہ کہ آپ کی محبت کا اعتراف بھی کروں!

خدارا، آپ ہی انصاف فرمایئے کہ اس "شیوۂ ترکانہ" کو کیا سمجھوں اور کس امید پر بارگاہِ گرامی میں شرفِ ملازمت رکھنے کا دعویٰ کروں؟

باکدا ایں ذرہ سنجم آبروئے اعتبار
آنقدر ہیچم کہ از خود شرمسارم کردہ اند

آپ اور مجھے یاد فرمائیں! لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ آپ یاد فرمائیں اور میں اس کا شکریہ

ادا کروں! دنیا میں کسی پر احسان کرنا اتنا دشوار نہیں، جتنا اعتراف احسان! آپ کے لئے ان اوادل کی کمی نہیں اور میں جان صرف ایک ہی بار دے سکتا ہوں۔

ز چاکِ سینہ آہے می نویسم — کنانم حرفِ ما ہے می نویسم
محبت نامہ پردازست امروز — شرر بر برگِ کاہے می نویسم

اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں کتاں اور برگ کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔

حضرت المکرم۔ عطوفت نامہ پہونچا اور اُس وقت کہ اگر دو ایک دن اور انتظار کرنا پڑتا تو شاید میں نہ ہوتا۔ اس سے اپنی احتیاج و ضرورت کا اظہار مراد نہیں۔ بلکہ آپ کی چارہ سازیوں کی اہمیت کا اعتراف مقصود ہے یہ آپ نے سچ فرمایا کہ عدو بھی سببِ خیر ہو جاتا ہے اگر خدا چاہے۔ لیکن یہ آخری شرط ہی تو بڑی کٹھن ہے مجھے عدو کیطرف سے اتنا اندیشہ نہیں، جتنا اس سے کہ خدا کیوں چاہنے لگا۔

میری خواہش تو یہ تھی کہ آپ خود اپنی سعی و تدبیر پر اعتماد کر کے مجھے کسی بات کا یقین دلاتے، لیکن آپ نے پھر معاملہ کو خدا پر چھوڑ دیا۔ اور خدا کا تصور میرے ذہن میں اتنا بلند ہے کہ اگر میں اپنی رسائی اُس تک ممکن سمجھ لوں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ میں نے خدا کے وجود کو محال تسلیم کر لیا، درانحالیکہ وہ واجب الوجود ہے!

آپ کو شاید یہ بات پسند نہ آئے، لیکن کیا کروں اپنی فطرت سے مجبور ہوں، اور "تذبذب" میں زندگی بسر کرنا میرے امکان میں نہیں۔ بہرحال آپ خود جس حد تک کوشش کر سکتے ہوں کیجئے اور نتیجہ سے مطلع فرمایئے لیکن اگر آپ کچھ نہ کر سکتے ہوں تو بھی صاف صاف کہدیجئے، میں مایوسی و ناکامی سے ڈرنے والا انسان نہیں۔

محترمہ، اس دوران میں آپکے دو خط مجھے ملے اور اس قدر جلد جلد کہ میں کچھ بدحواس سا ہو گیا۔ بدحواسی صرف اس لئے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو دیکھنا کیسا، سننے کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔

یقیناً وہ زمانہ مجھے یاد ہے جب آپ یہاں "مردانہ عزم و ثبات" کی زندگی بسر کر رہی تھیں اور میں آپکی "مردِ خنکن" نسائیت کو دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کیا ایک عورت کے لئے اُس سے زیادہ عذاب ممکن ہے — لیکن خیر، فکر ہے، یہ زمانہ جلد ختم ہو گیا اور آپ اس "اعصابی کشاکش" سے آزاد ہو گئیں۔

اس کے بعد جب دہلی سے آپ کا خط آیا تو میں پھر یک گونہ مسرور ہو گیا کیونکہ اس میں آپ نے خود اُس بات کو چھیڑا تھا، جس کے جواب میں، ایکبار میں نے "پُر حقارت تبسم" کا منظر دیکھ چکا ہوں۔ یاد نہیں میں نے آپ کو کیا جواب دیا، لیکن اتنا ضرور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ نے ارادہ کی مخالفت نہ کی ہو گی۔

بہرحال وہ تو جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا، اب ماضی کی داستان دُہرانا، سوائے اس کے کہ تھوڑی دیر کے لئے میں بھی بدمزہ ہو جاؤں اور آپ بھی تیوریاں چڑھا کر منہ پھیر لیں، کوئی نتیجہ خیز بات نہیں —— خیر،

ہاں، تو فرمایئے آپ سوری کب جا رہی ہیں، اور وہاں آپ کیا کریں گی؟ وہی کروشیا کی سلائی اور وہی

کسی کی طرف نہ دیکھتے ہوئے انگلیوں کی مسلسل حرکت! یعنی وہی۔

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز

سچ کہتا ہوں، آپ کی اس کروشیا نے اتنا ستایا ہے کہ شاید ہی کوئی رقیب مجھے اتنا دکھ دیتا، اگر میرے آپکے تعلقات میں واقعی کسی رقیب کا گزر ہو سکتا!

آپ پہلی مرتبہ سوری جا رہی ہیں، آپ کو معلوم نہیں وہاں جب کالے کالے بادلوں میں سرخ سرخ ڈیلیا پھولتا ہے، تو یہ "کاک ٹیل"، دماغ انسانی پر کیا اثر کرتی ہے۔ مجھ پر اول اول جو اثر ہوا تھا، اسکو میں اگر بیان کردں بھی تو کیا آپ کو اعتبار نہ آئے گا۔ اور اعتبار آ بھی جائے تو زبان سے کبھی اس کا اقرار نہ کرین گی، اس لئے کہنا فضول ہے، آپ کی اس "دعوتِ آب و ہوا" کو میں ضرور قبول کرتا، اگر میں یہ جانتا کہ "موسم" ساز گار ہے۔

خدا حافظ!

کرمی - آپ کے مقالہ کو کئی بار پڑھا اور ہر بار نہایت غور سے پڑھا — خیال اچھوتا، زبان دلکش، انداز بیان پیارا — لیکن قصور معاف، روح کا کہیں پتہ نہیں! آپ پوچھیں گے کہ روح کیا، اور میں اس کا کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔

آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ ناک، کان، آنکھ، لب سب اپنی اپنی جگہ نہایت اچھے ہیں اور نقشہ بھی برا نہیں، لیکن خدا جانے نگاہ کیوں نہیں چکپتی — بس یہی "خدا جانے" والی چیز آپ کے مقالہ میں نہیں ہے۔

آپ نے اگر میری آزاد رائے دریافت نہ کی ہوتی تو شاید میں یہ جرأت نہ کرتا اور اب بھی بہت ڈرتے ڈرتے لکھ رہا ہوں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو بات میں نے کہی ہے اسکے سمجھنے والے بہت کم ہیں، آپ ضرور شایع کرائیے، دنیا ضرور داد دے گی۔

کرمی - جی ہاں، مینے فروش والے اشعار دونوں حضرات کے دیکھے۔ ان میں سے ایک تو خیر معذور ہیں کہ انھوں نے فارسی پڑھی ہی نہیں۔ لیکن دوسرے اسکے مدعی ہیں اور اُن پر ضرور حیرت ہے، آپ کی رائے سے میں بالکل متفق ہوں۔ فارسی میں اس لفظ کا استعمال ایک تو بالکل لغوی معنے میں ہوتا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے، لیکن دوسرا استعمال ذرا مشکل ہے۔ کیونکہ اس میں زیادہ تر مجازی رنگ ہوتا ہے اور وہ بھی کبھی طنز کا رنگ لئے ہوئے اور کبھی فخر و مباہات کا جس کو یہ "حقیقی" شاعری کرنے والے کم سمجھتے ہیں۔ بیدل کہتا ہے۔

تو و صد موج گوہر تمکیں — من و یک اشک اضطراب فروش

آپ نے دیکھا کہ اس میں ہلکا سا مفہوم تحقیر و طنز کا پوشیدہ ہے لیکن ذیل کے شعر میں فخر و مباہات کا رنگ ہے:-

سایہ پرور و جلوۂ یار ہم — خاک اگیر و آفتاب فروش

آپنے جو کلام بھیجا ہے، اس میں اکثر جگہ فروش کا استعمال غلط کیا گیا ہے۔ لیکن آپ کیوں اس الجھن میں پڑیں۔ لکھدیجئے۔

عرقے گل کن و گلاب فروشس

باب الاستفسار

کلام مومن

(جناب سید سجاد علی میرزا۔ سہارنپور)

کلام مومن کی شرح کا سلسلہ کچھ عرصہ سے ملتوی ہے۔ آخری اشاعت میں جس غزل تک یہ سلسلہ پہونچا تھا اسکے بعد کے اشعار جو میرے نزدیک وضاحت طلب ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ براہ کرم ان پر اظہار خیال فرمایئے:

۱۔ اُس حسن پہ خلوت میں جو حال کیا کم تھا — کیا جانئے کیا کرتا گر تو مری جا ہوتا

اس شعر میں "جو حال کیا کم تھا" تشریح طلب ہے۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ ظاہر کیا ہے کہ شاعر نے اپنی بیباکی و بیتمیزی کی معذرت کی ہے، لیکن کیا اس سے یہ مراد نہیں ہوسکتی کہ اس نے اپنی انتہائی شیفتگی و دیوانگی کی معذرت کی ہے

۲۔ اچھی مری بدنامی تھی یا تری رسوائی — گر چھوڑ نہ دیتا میں، پامالِ جفا ہوتا

۳۔ ہم بندگی بت سے ہوتے نہ کبھی کافر — ہر جائے گر اے مومن موجود خدا ہوتا

اس شعر میں مومن نے یہ ظاہر کیا ہے کہ خدا ہر جگہ نہیں ہے، حالانکہ یہ عقیدہ اسلام کے منافی ہے

۴۔ وہاں ترقی جمال کو ہے، یہاں محبت ہے روز افزوں — شریک زیبا تھا بوالہوس بھی جو بیوفائی میں کم نہ ہوتا

اگر رقیب بیوفائی میں کم ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک حد تک وفادار بھی ہے، پھر مومن کو کیا شکایت ہے؟

۵۔ غلط کہ صانع کو ہے گوارا خراشہائے انگشتہائے نازک — جواب خط کی امید رکھتے جو قولِ جف القلم دہوتا،

۶۔ ہوا مسلماں میں اور ڈر سے نہ درسِ واعظ کو سنکے مومن — بنی تھی دوزخ بلا سے بنتی، عذاب ہجرِ صنم نہ ہوتا

"اور ڈر سے" کیا مراد ہے؟

۷۔ ملے ہو غیر سے بے پردہ تم انکار کے بعد — جلوہ خورشید کا تھا کچھ اُدھر آخرِ شب

۸۔ صبحدم آنے کو وہ تھا کہ گواہی دے ہے — رجعتِ قہقری چرخ و قمر آخرِ شب

۹۔ موسفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن — بہ آرام دگر آخرِ شب

"بہ آرام دگر" کیا معنے

۱۰۔ ضبط نالہ بوالہوس کا ننگ کے باعث نہیں — شرم سے آہ و فغانِ بے اثر رکھتے ہیں آپ

۱۱۔ آوارگی ہے باعثِ نشو و نما کہ دیکھ — سرسبز جب ہوئی کہ پھری در بدر بسنت

کیا "بسنت پھرنا" کوئی محاورہ ہے۔ اگر ہے تو اس کا مفہوم کیا ہے اور نشو و نما کا اس سے کیا تعلق؟

۱۲۔ مومن یہ کیا کہا کہ ہے رسم ہنود، اب — کاہیکو لائیں گے وہ مری گور پر بسنت

"گور پر بسنت لانا" کیا؟

۱۳- آئینہ میں ہو نہ موم جادو — سوئے نہیں آپ تا سحر رات

"موم جادو" سے کیا مراد ہے؟

۱۴- پنجۂ شانہ سے تو زلفِ گرہ گیر نہ کھینچ — دل سے دیوانہ کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

"دل سے مت چھیڑ" کیا؟

۱۵- اے ستم پیشہ مرے بعد کہاں نشۂ عشق — دیکھ خمیازۂ حسرت ہے یہ شمشیر نہ کھینچ

(نگار) ۱- اس میں شک نہیں کہ "جو حال کیا کم تھا"، آپ کے ظاہر کئے ہوئے مفہوم کو بھی ظاہر کرتا ہے، لیکن دوسرے مصرعہ سے یہ بات مترشح ہے کہ مومن معذرت کر رہے ہیں اور معذرت ہمیشہ بُری ہی کی ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں صرف انتہائی شیفتگی یا دیوانگی مراد نہیں ہو سکتی جو کوئی بری بات نہیں

۲- مومن اپنے محبوب سے ترکِ اُلفت کی وجہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اگر میں محبت ترک نہ کرتا تو تم جفا کرتے اور اس طرح تم بدنام ہوتے۔ اسلئے اگر میں ترکِ اُلفت سے بدنام ہوا تو ہوا، تم تو رسوائی سے بچ گئے

۳- یہ عقیدہ اسلام کے منافی نہیں ہے۔ لیکن اگر ہے تو پھر مومن کے اس اعتراض کا جواب اہلِ مذہب کو دینا چاہئے۔ کیونکہ اگر خدا واقعی ہر جگہ موجود ہے تو بُت کے اندر بھی ہے، پھر بُت پرستی کو کفر کہنا کیا معنی؟

۴- مومن کو صرف یہ شکایت ہے کہ رقیب بیوفائی میں بھی پکا نہیں، محبت میں کیا پکا ہو سکتا ہے

۵- بربنائے روایت حدیث مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہوتا تھا یا ہوگا اسے قلم لکھ کر قلم خشک ہو گیا (جف القلم بما ہو کائنٌ) اسلئے جواب خط کی امید رکھنا عبث ہے، کیونکہ قدرت نے یہ کبھی گوارا نہ کیا ہوگا کہ محبوب کی نازک اُنگلیوں کو جواب دینے کی زحمت میں مبتلا کیا جائے۔

۶- "اورڈر" سے مراد "ہجرِ صنم" کا عذاب ہے

۷- آخر شب میں خورشید کی سی جھلک غیر کے مکان میں نظر آئی تو معلوم ہوا کہ تم اُس سے پردہ کئے ہو، "انکار کے بعد" کا پتہ آخر شب سے چلا۔ ورنہ ابتداءِ شب ہی میں یہ جھلک نظر آتی

۸- چونکہ اسے صبح کے وقت آنا تھا اس لئے صبح ہوتے ہوتے چرخِ دوّار نے پھر الٹی گردش شروع کر دی تاکہ صبح ہی نہ ہو

۹- "بہ آرامِ دگر" سے مراد زیادہ آرام ہے

۱۰- بوالہوس نے ضبطِ نالہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ اسے ننگ سمجھتا ہے بلکہ اس شرم سے نہیں کیا کہ اس کے نالہ و فغاں بے اثر ہے

۱۱- بسنت میں گیہوں کی نئی بالی لیکر احباب کے یہاں جاتے ہیں۔ اس کو بسنت پھرنا کہتے ہیں اور سرسبزی سے مراد اس رسم کی کامیابی ہے جو اس آوارگی یا در بدر پھرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے

۱۲- بسنت کے زمانہ میں قبروں پر پھول اور چادر چڑھاتے ہیں ـــــ ۱۳- جادو میں موم بھی جلاتے ہیں۔

۱۴- "دل سے مت چھیڑ" آپ نے کہاں سے لیا۔ تتے، ایسے کے معنے میں استعمال ہوا ہے، یعنی دل ایسے دیوانہ کو مت چھیڑ

۱۵- معشوق تلوار کھینچ کر مومن کو قتل کرنے آیا تو انھوں نے اسے سمجھایا کہ مجھے قتل تو کرتا ہے لیکن یہ سمجھ لے کہ میرے بعد ایسا نشۂ عشق رکھنے والا نہ ملیگا اسکی وہ شاعرانہ تعبیر یوں کرتے ہیں کہ جس تلوار سے تو مجھے قتل کر رہا ہے اسکا خم بھی خمیازۂ حسرت کا حکم رکھتا ہے، یعنی تلوار خود سمجھتی ہے کہ اب مومن ایسا نشۂ عشق رکھنے والا کبھی نہ ملے گا۔

معلومات

چینیوں میں ہر سال ایک عجیب و غریب تہوار منایا جاتا ہے، جسے "مکھن کی عید" کہنا چاہئے۔ اس دن، مکھن کو مختلف رنگوں سے رنگ کر اس کی مورتیاں بنائی جاتی ہیں اور مندروں میں رکھی جاتی ہیں۔ ان کے گلے میں جو پھولوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں وہ بھی مکھن ہی کے ہوتے ہیں اور مکھن ہی کی بتیاں بنا کر روشنی بھی کی جاتی ہے

یہ تہوار دسویں قمری مہینے کی ۱۵ کو پڑتا ہے اور صرف ایک رات قایم رہتا ہے، کیونکہ صبح تک مکھن کی دیویاں، روشنیاں اور آرایشیں سب گھل کر ختم ہو جاتی ہیں

روایت یہ ہے کہ ۱۴۱۸ء میں ایک دیوی جس کا نام انھوں نے "تسونخ کا پا" رکھا تھا، اسی تاریخ میں ایک مندر کے اندر نمودار ہوئی تھی اور صبح کو آسمان پر چلی گئی تھی۔ اسی تقریب میں یہ تہوار منایا جاتا ہے اور اس دیوی کی مورتی مکھن سے اسی لئے طیار کی جاتی ہے کہ وہ بھی صبح تک غائب ہو جائے

شہر منچسٹر میں ایک عجیب و غریب انجمن ہے جس میں صرف عورتیں شریک ہو سکتی ہیں۔ اس انجمن میں روزانہ شرکت ضروری ہے اور یہاں کام صرف یہ ہوتا ہے کہ ہر عورت آدھ گھنٹے تک بالکل خاموش بیٹھی رہے، اگر اتفاق سے کوئی بات کسی کے منہ سے نکل جائے تو اس پر سخت جرمانہ کیا جاتا ہے

اس انجمن کے قیام کا مقصود عورتوں میں قوت ارادی پیدا کرنا ہے تاکہ خاموشی کے وقت وہ خاموش رہنا سیکھیں اور اپنی قوت گویائی کا بیجا صرف نہ کریں

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم کسی بلند مینار یا برج پر پہونچتے ہیں اور نیچے کی طرف دیکھتے ہیں تو سر چکرانے لگتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز نیچے کو کھینچ رہی ہے اور ہم گر پڑیں گے

اس کے دو سبب بیان کئے جاتے ہیں ایک یہ کہ زمین اپنی طرف کھینچتی ہے اور دوسرے یہ کہ ہم پہلے ہی سے گرنے کا خوف اپنے دل میں لیکر وہاں جاتے ہیں، لیکن دراصل اس کا سبب کچھ اور ہے

بات یہ ہے کہ جس وقت ہم کسی بلند مینار یا برج پر چڑھتے ہیں تو ہماری نگاہ ایک ہی وقت میں برج کی بلندی کو بھی دیکھتی ہے اور زمین کے نشیب کو بھی اور یہ دونوں زاوئے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ اعصاب بصارت میں بیچینی پیدا ہو جاتی ہے اور دوران سر کی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے

دنیا میں اس وقت سب سے بڑا سکہ تانبہ کا وہ سکہ ہے جسے ولایت ہیسی کے فرمانروا فیڈریک نے ۱۷۳۱ء میں رائج کیا تھا۔ اس کا قطر ۱۰ انچ تھا اور ۱۲ شلنگ قیمت ـــ اس قسم کا ایک سکہ لندن کی نمایشگاہ سکہ جات میں تقریباً چار گنی کو خرید گیا وہاں اب تک موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے بڑا سکہ کبھی نہیں بنایا گیا

امریکہ کے شہر پٹسبرگ میں ایک کارخانہ کی عمارت ایسی طیار کی گئی ہے جس میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ یہ عمارت بہت بڑی ہے جس میں سیکڑوں کھڑکیاں ہونا چاہئے تھی، لیکن سیکڑوں کے بجائے اس میں ایک کھڑکی بھی نہیں ہے

یہاں روشنی کا انتظام صرف بجلی کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اور مختلف رنگ کی روشنیاں مختلف مقامات پر ڈالی جاتی ہیں۔ یعنی چھتوں پر جس رنگ کی روشنی پڑتی ہے وہ دیواروں کی روشنی سے مختلف ہوتی ہے اور فرش پر جس قسم کی روشنی ہوتی ہے وہ اس روشنی سے مختلف ہوتی ہے جو مشینوں کے پر پڑتی ہے

یہاں کے کام کرنے والے کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ اس عمارت میں کھڑکی نہیں ہے اور وہ سورج کی روشنی سے محروم ہیں۔ ہوا کا انتظام بھی یہاں بجلی ہی کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اور آکسیجن کی ضروری مقدار بھی بجلی ہی کی مدد سے فراہم کی جاتی ہے

نباتات کی جس کا تجربہ روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے۔ روشنی اور حرارت کی جس تو خیر ظاہر ہی ہے، لیکن حال کے تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ سُن کر دینے والی دواؤں کا بھی ان پر اثر ہوتا ہے اور جرمنی کے ایک عالم نے ثابت کیا ہے کہ نباتات موسیقی سے بھی بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اس نے ایک باغ میں مختلف پھولوں کے پودے نصب کئے اور پھر ان کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک جگہ پیانو بجائے جانے کا انتظام کیا۔ چند دن کے بعد بالکل ظاہر طور پر محسوس کیا گیا کہ جن پودھوں کے پاس پیانو بجایا جاتا ہے ان کا نشوونما بہت تیزی سے ہو رہا ہے اور جو پودے اس نعمت سے محروم ہیں، ان کا نشوونما نسبتاً بہت سست ہے

روزولٹ صدر امریکہ بہت چھوٹے تھے کہ ان کے والد ایک دن کسی ضرورت سے باہر سفر پر جانے لگے۔ جاتے وقت اپنے لڑکے (موجودہ صدر) کو بلایا اور کہا کہ دیکھو میں باہر جارہا ہوں، میری غیبت میں اپنی ماں کی خبر رکھنا اور ان کا کہنا ماننا۔ رات کو سوتے وقت حسب معمول جب اس کی ماں خوابگاہ تک پہونچانے آئیں اور اس نے دوزانو ہوکر دعا مانگی تو اُس کے الفاظ یہ تھے:

"اے خدا، تو میرے باپ کی خبر رکھ اور اسے جلد واپس کردے، میری ماں کی فکر کر، میں اس کا نگہبان ہوں"

اوسلو میں جہاں بہت سی اصلاحیں ہوئی ہیں، وہیں ایک اصلاح قید خانوں کی بھی ہے۔ مجرموں کو سزائے قید دینا اور جیل میں رکھ کر اُن سے کام لینا صرف انتقامی صورت رکھتا ہے اور اس سے اخلاق و عادات کی اصلاح نہیں ہوتی

روسی حکومت نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر وہاں ایک "نو آبادی" قایم کی ہے جہاں ملک کے ہر گوشہ سے مجرموں کو بھیجدیا جاتا ہے اور انھیں کامل آزادی دیدی جاتی ہے کہ اپنی زندگی جس کام میں چاہیں بسر کریں۔ یہاں زراعت و باغبانی کے علاوہ اور بہت سی صنعتیں بھی یہاں سکھائی جاتی ہیں، لیکن کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ فلاں کام کرے اور فلاں کام نہ کرے، لیکن حکومت انکے کھانے پینے کی ذمہ دار صرف اسی صورت میں ہوتی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کام کریں

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی صنعت میں لگ جاتے ہیں اور چند سال میں بہیئت اجتماعی کے لئے ایک مفید عضو ثابت ہوتے ہیں

اہل امریکہ کی دولت اور انکے اسراف کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ وہاں شہر کنساس میں ایک ایسا موٹر طیار کیا گیا ہے جسکی قیمت چار لاکھ روپیہ ہے، مشینری کے علاوہ ہر چیز اس میں سونے چاندی کی ہے، یہاں تک کہ اسکی آرائش میں ایک لاکھ کے جواہرات صرف ہوئے ہیں۔ یہ یادگار ہے کارخانہ کی بنیاد رکھنے والے کی اور جس کی حفاظت کے لئے پولیس کا ایک دستہ ہر وقت متعین رہتا ہے

یورپ اور تمام دُنیا میں قاعدہ ہے کہ شادی کی درخواست مرد کی طرف سے کی جاتی ہے، - - - - - - - - - - - - - - -

لیکن انگلستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر چوتھے سال (سال کبیسہ میں) عورتوں کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ جس مرد کو چاہیں پیام دیں۔

اس سے زیادہ عجیب بات اسکاٹ لینڈ کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔ وہاں ۱۲۲۸ء میں ایک قانون وضع کیا گیا تھا کہ ہر لڑکی کو اجازت ہے کہ وہ جس مرد کو چاہے شادی کا پیام دیسکتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ یہ پیام زبان ہی سے ادا کیا جائے، ہاتھ کی حرکت، آنکھ کے اشارہ اور ابرو کی جنبش سے بھی یہ پیام دیا جاسکتا ہے اور مرد کا فرض ہے کہ وہ اس پیام کو قبول کرے۔

دماغی تفریح

پچھلے مہینے دماغی تفریح کے سلسلہ میں عقلی جنتری بنانے کی دعوت دیگئی تھی اور ۱۹ درختوں کے نصب کرنے کے لئے ۹ ایسے خطوط مستقیم دریافت کئے گئے تھے کہ ہر خط میں پانچ درخت شمار کئے جاسکیں ان دونوں کا صحیح جواب سب سے پہلے محمد معین الاسلام نے رائے پور سے بھیجا ہے اس لئے ہندی شاعری نمبر اور جذبات بھاشا کی ایک ایک جلد ذریعہ پوسٹل سرٹیفکٹ ۲۳ اپریل کو ان کے پاس بھیجدی گئی۔ ان کے بھیجے ہوئے حل یہ ہیں:

۱۹۴۱ء

(۱) عقلی جنتری:

جنوری	فروری	مارچ	اپریل	مئی	جون	جولائی	اگست	ستمبر	اکتوبر	نومبر	دسمبر
۲	۶	۶	۲	۴	۷	۲	۵	۱	۳	۶	۱

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر
۱	۲	۳	۴	۵	۶	صفر

فرض کیجئے ہم معلوم کرنا چاہیں کہ ۴ مئی کو کونسا دن پڑے گا تو ۹ میں ۴ کا اضافہ کیجئے (جو مئی کے نیچے درج ہے) اس کا مجموعہ ۱۳ ہوا۔ اسے آپ ہفتہ کے سات دن سے تقسیم کیجئے تو باقی ۶ بچے گا جو جمعہ کا دن ہے۔

(۲) درختوں والے معمہ کا حل اس طرح ہے:

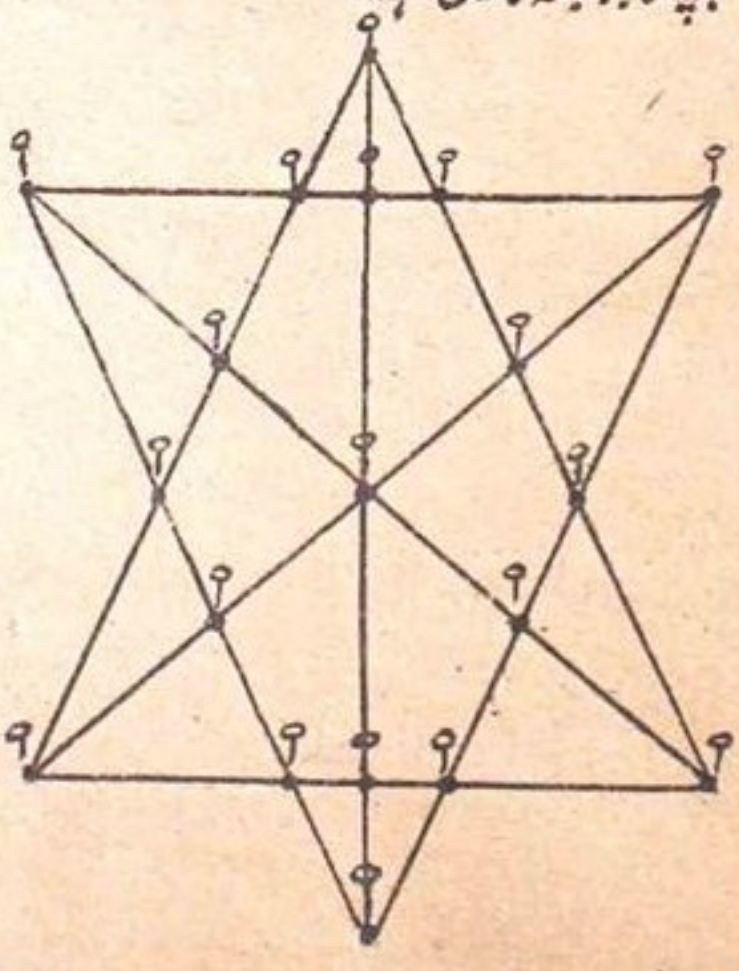

آپ دیکھیں گے کہ اس میں ۹ خطوط مستقیم ہیں اور ہر خط پر پانچ درخت شمار کئے جاسکتے ہیں درانحالیکہ کل درختوں کی تعداد ۱۹ سے زیادہ نہیں ہے۔

اِس مہینے کی تفریحات : ذیل میں دیا سلائی کی بارہ تیلیوں سے چار ایسے مربع طیار کئے گئے ہیں، جو ملکر خود ایک بڑا مربع بناتے ہیں :-

(۱) کیا آپ ان تیلیوں کو اس طرح رکھ سکتے ہیں کہ ان سے تین مثلث بالکل برابر ناپ کے بن جائیں۔ سب سے پہلے جو اس کا جواب بھیجے گا اُسے "شاعر کا انجام" دیا جائے گا۔

(۲)

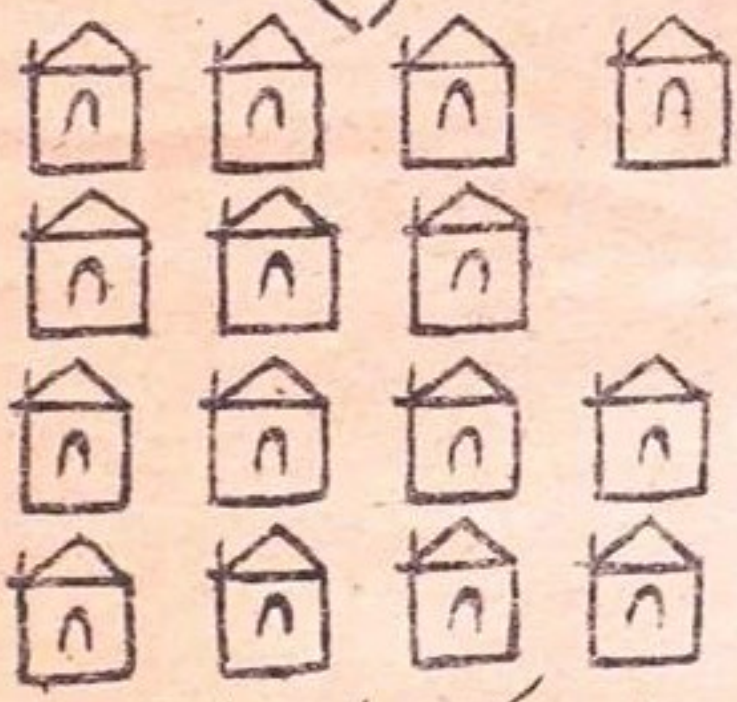

اوپر کے نقشے میں آپ پندرہ جھوپڑے دیکھتے ہیں جو ایک قبیلہ کے مختلف خاندانوں نے طیار کئے تھے ان میں ایک جھوپڑا سردار کا بھی تھا اس سردار کا فرض تھا کہ وہ روز صبح کو ہر جھوپڑے پر پہونچکر وہاں کی خیریت دریافت کرے۔ لیکن یہ کام اسے مشکل نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ ان جھوپڑوں پر اس طرح پہونچنا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ چھ خطوط مستقیم ہیں اور صرف پانچ مرتبہ اسے مڑنا پڑے، چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوگیا۔

آپ بتائیے کہ سردار کا جھوپڑا کونسا تھا اور اس نے یہ راستہ کیونکر مقرر کیا تھا۔

سب سے پہلے جس کا حل موصول ہوگا، اسے "جذبات بھاشا" کی ایک جلد دیجائے گی۔

(۳) احمد کو اس بات کا بڑا شوق تھا کہ جب وہ کسی سے ملے تو اس کی عمر دریافت کرے۔ ایک بار وہ اپنے بھائی کے یہاں مہمان گیا جس کے دو لڑکے تھے زکی اور مشتاق۔ احمد جب ان سے ملا تو چھوٹتے ہی سوال کیا کہ تمھاری عمر کیا ہے۔

یہ لڑکے اپنے چچا کے اس خبط سے واقف تھے اس لئے انھوں نے پریشان کرنے کے لئے سب ذیل جوابات دئے:

زکی ۔ "میری عمر، میری ماں کی عمر کی تہائی ہے"

مشتاق ۔ "میری عمر، میرے والد کی عمر کی چوتھائی ہے"

یہ سُنکر زکی بولا ۔ "لیکن بارہ سال کے بعد میری عمر میرے والد کی عمر کی نصف ہو جائے گی"۔

مشتاق نے کہا ۔ "اُس وقت میری عمر بھی میری ماں کی عمر کی نصف ہوگی"

احمد یہ جواب سُنکر پریشان ہوگیا اور پھر اس نے کسی کی عمر نہیں پوچھی ۔ آپ بتائیے کہ ان دونوں لڑکوں کی کیا عمر تھی؟ اور آپ نے کیونکر معلوم کی ـــــ سب سے پہلے جس کا حل پہونچے گا اسے "فراست الید" کی جلد ملے گی۔

نعرۂ شباب :

ہر اک گام پر ٹھوکریں کھا رہا ہوں
مگر بے تکلّف چلا جا رہا ہوں

نئی آفتوں کو یہ پیغام دے دو
کہ میں اُن کی تعظیم کو آ رہا ہوں

حوادث کو یہ حادثہ بھی سنا دو!
ابھی تک میں ہنس ہنس کے لہرا رہا ہوں

مجھے مت بلاؤ، مجھے مت ستاؤ
میں تسخیرِ کونین کو جا رہا ہوں

سمندر کے خوابوں میں ہے جو تموّج
مین اُس کی نگاہوں کا رُخ پا رہا ہوں

ہوا کے تصور میں ہیں جو بہاریں
میں اُن کو ذرا ہوش میں لا رہا ہوں

وہ بجلی جو ہے ذہن میں بادلوں کے
میں اُس کو فضاؤں پہ چمکا رہا ہوں

کھنکتے ہوئے جام ہاتھوں میں لے کر
مہکتے ہوئے رنگ برسا رہا ہوں

محبّت کا مشعل اُٹھا کر نشے میں
ہر اک راستہ چیرتا جا رہا ہوں

زمانے کے چہرے سے زلفیں ہٹا کر
شگفتہ دنوں کی قسم کھا رہا ہوں

فقط ایک ہلکا سا سایہ ہوں لیکن
زمان و مکاں پر عدمؔ چھا رہا ہوں

حقائقِ رنگیں :

رَو میں سیلاب ہے، تھمتے ہی تھمے گا ساقی
رَم میں سیماب ہے، تھمتے ہی تھمیگا ساقی

زیست کا ساز ہے اور عشرتِ نغمہ کا جنوں
دل بیتاب ہے، تھمتے ہی تھمیگا ساقی

روح مضطر ہے، سکوں آتے ہی آئے گا اسے
دیدہ پُر آب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

عقل اِک سنگِ سبک وزن ہے کیا ٹھہرے گی
عشق سیلاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

ٹوٹتے ٹوٹے گا افسونِ فریبِ ہستی!!
رعشۂ خواب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

باؤلی آنکھ ہے، کھا جائے گی صورت کا فریب
شوق بیتاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

چاندنی رات میں ہم پیتے رہیں گے پیہم
دَورِ مہتاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

ناچتی جائے گی فطرت مری، غم ہو کہ خوشی
رقصِ اعصاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

ظلمتِ غم میں بھی چمکے گی جوانی کی جبیں،
سحرِ شب تاب ہے تھمتے ہی تھمیگا ساقی

رَو میں حالات کی بہنا ہے عدمؔ کو کچھ روز
ایک سیلاب ہے، تھمتے ہی تھمیگا ساقی

عدمؔ

غزل : قیصر امراوتی

دل خون ہو رہا ہے مگر اس خوشی کو دیکھ
اے غم نصیب باغ میں ہنستی کلی کو دیکھ

کیا کیا نیازِ عشق کے احساں ہیں حُسن پر
ہونے نہ پائے اس کی خبر بھی کسی کو دیکھ

حسرت بھری نگاہ اُٹھی اُٹھ کے رہ گئی
اے بے نیاز سجدہ مری بندگی کو دیکھ

غمگیں رہیں گی یہی دل کی عمر بھر
ہنستے ہوئے نشاط و غمِ عارضی کو دیکھ

اک دردِ لادوا ہے خزاں کیا بہار کیا
اے چارہ سازِ حسرتِ بیچارگی کو دیکھ

رسوا کبھی ہوا ہی نہیں ذوقِ اہلِ درد
پابندیِ رسومِ غمِ عاشقی کو دیکھ

تاریکیاں ہزار سہی اے دلِ حزیں
داغوں کی روشنی میں شبِ زندگی کو دیکھ

جلنا ہے آشیانہ جلے تو نہ دل جلا
قیصر چمن میں اہلِ چمن کی خوشی کو دیکھ

شاعر کا اضطراب

ابھی بے روح، جسمِ زندگی محسوس کرتا ہوں
ابھی بے جسم، روحِ زندگی معلوم ہوتی ہے

ابھی محتاجِ مشاطہ نظر آتا ہے ہر پیکر
ابھی ہر حُسن میں مجھ کو کمی معلوم ہوتی ہے

ابھی الفاظ پر شاعر کو قدرت ہی نہیں گویا
کہ مبہم صورتِ معنی ابھی معلوم ہوتی ہے

وہاں کُل قوتِ تخلیق ہی ہے صرف زیبائی
یہاں تصویر "کُن" بے رنگ ہی معلوم ہوتی ہے

ازل کے دن سے جس کی چشمِ بینا کو شکایت تھی
وہی بے رونقی سی آج بھی معلوم ہوتی ہے

مجھے دل، پسلیاں اُبھری ہوئی سی، گال بیٹھے سے!!
یہی تصویرِ شکلِ آدمی معلوم ہوتی ہے

بھکاری بھیک پا کر مُسکرا دیتا ہے قسمت پر
مجھے یہ بھی ادائے بیکسی معلوم ہوتی ہے

غضب ہے رنجِ پیہم کا مسرت نام رکھا ہے
ابھی معدوم دُنیا سے خوشی معلوم ہوتی ہے

نہیں معلوم مجھکو بھی مرا دل چاہتا کیا ہے
طبیعت ہر گھڑی بیتاب سی معلوم ہوتی ہے

"کسے معلوم میدانِ عمل ہے منتظر میرا"
ابھی احباب کو یہ شاعری معلوم ہوتی ہے

عمل کے جذبۂ بیتاب کا جب راز کھلتا ہے
تو ہر الزام سے فطرت بری معلوم ہوتی ہے

اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا ہے ہر طرف ہر سو
مگر کچھ دور کچھ کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے

اسی ظلمت کے آگے روشنی ہی روشنی ہوگی
وہی ظلمت جو حدِ آخری معلوم ہوتی ہے

محب عارفی. بی. اے (علیگ)

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام خطرناک اور غیر خطرناک قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس سے بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز کہ مذاہب عالم نے اسکے علاج میں کتنی مدد دی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے قیمت تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعۂ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہ سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)
خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- ادیان کا مذہب۔

۳- حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا نے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲ر)
علاوہ محصول

نمبر خریدار .....

دفتر نگار ـــــ لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

_____

_____

_____

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس نیا گاؤں لکھنؤ (پرنٹر و پبلشر ایس۔ حسین)